ڈاکٹر وزیر آغا
عہد ساز شخصیت

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

Dr. Wazeer Agha   Ehd Saaz Shakhsiat

(Critisism: Articles)

By: Haider Qureshi

Year of 1st Edition:

ISBN

Price: Rs. 200/-

نام کتاب: ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین کا مجموعہ)

مصنف: حیدر قریشی

مصنف کا پتہ: Rossertstr.6, Okriftel,
65795 Hattersheim,Germany
E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: مصطفیٰ کمال پاشا

سنِ اشاعت اول: 1995ء

سن اشاعت دوم: 2012

انٹرنیٹ ایڈیشن

انتساب

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کے مدیر

اور عزیز دوست

ارشد خالد کے نام

جنہوں نے میری پاکستان سے غیر موجودگی میں
آغا جی سے میرے تعلق کو پوری طرح قائم رکھا

ڈاکٹر وزیر آغا

سے میرے تعلق کی نوعیت

''میں نے نجی گفتگو میں بھی وزیر آغا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔الٰہیاتی مسائل، روح کی حقیقت، انسان کی مخفی قوتیں، اور کائنات کی بے پناہ وسعتیں۔ان موضوعات پر ان سے کھل کر باتیں کی ہیں۔بعض ایسی باتیں جو اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی کبھی خوف محسوس ہوتا ہے وزیر آغا سے بے خوف ہو کر کی ہیں اور ان کی گفتگو سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ان کے گاؤں وزیر کوٹ میں کھیتوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے بھی دیکھے ہیں اور آسمان پر ڈوبتے سورج کا منظر بھی دیکھا ہے۔طویل وعریض کھیتوں میں کھڑے ہو کر میں نے یہ تجربہ بھی کیا کہ کس طرح معمولی سا زاویہ بدلنے سے سامنے کا سارا منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔اس سے کائنات کی نیرنگیوں کا اندازہ ہوا''

(اقتباس از مضمون ''عہد ساز شخصیت'')

حیدر قریشی کی اب تک کی تحقیق و تنقید کی کتب

☆ حاصلِ مطالعہ

☆ تاثرات

☆ ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت

☆ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت

☆ **ہمارا ادبی منظر نامہ** (چاروں کتابیں ایک جلد میں۔ زیرِ ترتیب)

☆ اردو میں ماہیا نگاری

☆ اردو ماہیے کی تحریک

☆ اردو ماہیے کے بانی۔ ہمت رائے شرما

☆ اردو ماہیا (ماہیا کے مجموعوں کے پیش لفظ)

☆ ماہیے کے مباحث

☆ **اردو ماہیا۔ تحقیق و تنقید**

(ماہیا کی تحقیق و تنقید کی پانچوں کتابیں ایک جلد میں

فہرست

ہوا کا رخ ہے تمہاری طرف وگرنہ مجھے
پلٹ کے جانا کبھی باعثِ ملال ہوا؟

عرضِ حال

میں نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں وقفہ وقفہ سے ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصی،فکری اور مختلف تخلیقی جہات پر مضامین لکھے تھے۔یہ مضامین ایک وقفہ کے بعد ۱۹۹۵ء میں ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیے گئے۔اب اسی کتاب کا نیااورنظر ثانی شدہ ایڈیشن ای بک کی صورت میں انٹرنیٹ پر پیش کرر ہا ہوں۔کوئی مناسب پبلشرمل گیا تو یہ کتاب شائع بھی ہو جائے گی۔

پہلے ایڈیشن کے مضامین کے ساتھ اس بار دو نئے مضامین''اوراق اور میں''اور''اوراق اور ماہیا'' بھی شامل کرر ہا ہوں۔یہ دونوں مضامین اوراق کے پینتیس سالہ نمبر کے موقعہ پر وزیر آغا کی فرمائش پر لکھے گئے تھے۔ماہیا والا مضمون ڈاکٹر وزیر آغا سے زیادہ متعلق نہیں ہے،تاہم ماہیا کے سلسلہ میں''اوراق'' کی جانب سے کی جانے والی حوصلہ افزائی کو دراصل وزیر آغا کی جانب سے حوصلہ افزائی میں شمار کیا جانا چاہیے۔مزید یہ کہ ماہیا کی بحث،مخالفت اور موافقت کے ساتھ انشائیہ کی روداد سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔سو میں نے چاہا کہ اس مضمون کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا جائے۔اپنے مضمون''اوراق اور میں'' میں میں نے بڑے ناز کے ساتھ لکھا تھا کہ جب سے ''اوراق'' میں چھپنا شروع کیا ہے کسی شمارے میں میری غیر حاضری نہیں ہوئی۔

''اوراق'' کے پینتیس سالہ نمبر کی اشاعت کے بعد اس کی اشاعت معطل ہو گئی۔ایک وقفہ کے بعد جب نیا شمارہ آیا تو اس میں میری کوئی تحریر شامل نہیں تھی۔ظاہر ہے یہ میرے لیے ایک ذاتی صدمے جیسی بات تھی۔سو میں نے اپنی شکایت کا اظہار کر دیا۔آغا صاحب نے پھر میری تخلیقات کے لیے تقاضا کیا لیکن مجھے پہلی غیر حاضری کا اتنا افسوس ہوا کہ پھر جی نہیں چاہا کہ

’’اوراق‘‘ کے لیے کچھ بھیجوں۔ چند شماروں کے بعد’’اوراق‘‘ اپنے تیسرے دور کے بعد بند ہو چکا ہے۔اس کی اشاعت کے دوسرے دور میں اس کا میرا(۱۹۷۹سے۲۰۰۰ءتک) بھر پور ساتھ رہا اور میری علمی و ادبی تربیت میں آغا صاحب اور’’اوراق‘‘ کا بڑااہم کردار رہا ہے۔لیکن اس کے بعد اوراق سے ایسا گلہ ہوا کہ چھپنے کو جی نہیں مانا۔ایک آدھ بار آغا صاحب نے میری کوئی مطبوعہ چیز ازخود شائع کر دی لیکن پھر بھی میرا جی نہیں مانا۔اس کے پس منظر میں جو کچھ تھا وہ بہر حال میرے اور آغا صاحب کے درمیان کی بات ہے۔

معمولی سی رنجش اور وقتی ناراضی کے باوجود’’اوراق‘‘ کے سابقہ رول اور آغا صاحب کی ہمیشہ کی محبت اور تربیت اب بھی میرا اثاثہ ہے۔آغا صاحب کے علمی و ادبی اثرات مجھ پر خاصے گہرے ہیں، میں اپنی کامیابیوں میں ان اثرات کو بھی شمار کرتا ہوں۔

وزیر آغا کے علمی و ادبی کوائف میں اس دوران بہت پیش رفت ہو چکی ہے، میں نے ممکنہ حد تک نئی کتابوں کے ناموں کا اضافہ کر دیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ ابھی یہ کوائف نامکمل ہیں۔

اپنے پرانے مضامین پڑھتے ہوئے مجھے وہ دن یاد آتے رہے جب ڈاکٹر وزیر آغا کے مخالفین نے اخبارات کے ادبی صفحات پر جھوٹے پروپیگنڈے کی مہم چلا رکھی تھی۔اتنا بے بنیاد مگر منظّم پروپیگنڈہ ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے وزیر آغا کی کتابوں کو پڑھ رکھا تھا وہ الزامات کو پڑھ کر ہکا بکا رہ جاتے تھے۔اپنے مضامین لکھتے وقت چونکہ میرے ذہن میں ایسے پروپیگنڈے کی گونج موجود تھی اسی لیے میرے مضامین میں کہیں کہیں جذباتی کیفیت اور ردِعمل کی سختی در آتی رہی۔پھر ابتدائی ایام کی مضمون نگاری تھی تو اندازِ تحریر اب کی نسبت بہر حال کمزور تھا۔میں نے نظر ثانی (ایڈیٹنگ) کرتے وقت زیادہ تر جذباتی ردِعمل والی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے،تاہم اکا دکا جگہوں پر الفاظ کو جوں کا توں بھی رہنے دیا ہے۔نسبتاً کمزور تحریر اور ردِعمل کی سختی کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اور فن کی مختلف جہات پر میں نے جو کچھ لکھا تھا، مجھے وہ سارا لکھا ہوا آج بھی مکمل سچ لگتا ہے۔گویا کہیں کہیں جذباتی ہو جانے کا اقرار کرنے کے باوجود میں آج بھی اپنے موقف کو درست سمجھتا ہوں،سو اس کی پوری ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔

میں پورے وثوق سے لکھ رہا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے مخالفین میں سے پچانوے فی صد ایسے لوگ ہیں جنہوں نے انہیں پڑھے بغیر ان کی مخالفت میں اخباری سطح کی جملہ بازی کی۔ جن لوگوں نے وزیر آغا کو کچھ پڑھنے کے بعد مخالفت کی ،ان میں شروع سے لے کر اب تک ایسے مخالفین شامل تھے جو جملہ علوم سے بے بہرہ محض کسی ایک علم تک محدود تھے اور اس میں بھی ان کا مطالعہ درسی نوعیت کا تھا۔موسیقی سے لے کر نفسیات و فلسفہ تک کے جن طلبہ نے اس قسم کا کارِ خیر انجام دیا ان کے رویے پر مجھے وہ مثال یاد آ گئی کہ مختلف لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر انہیں ہاتھی کو چھو کر بتانا تھا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ چنانچہ کسی کو ہاتھی بڑے کان والا سجھائی دیا تو کسی کو ٹھوس ستون جیسا،کسی کو لجلجا سا محسوس ہوا تو کسی کو پہاڑ جیسا۔۔۔یعنی جس نے اپنا ہاتھ جہاں مس کیا اس نے صرف اتنا ہی اسے سمجھ لیا۔وزیر آغا کے معاملہ میں پڑھے لکھے کہلانے والوں کی طرف سے یہی خرابی ہوئی کہ کسی ایک شعبے میں ہلدی کی گانٹھ ملنے پر پنساری بن بیٹھنے والوں نے وزیر آغا کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے اپنے اپنے محدود نصابی دائرے کی پٹی باندھ کر انہیں دیکھنے کی کاوش کی۔یوں وزیر آغا کے ہاں دریا میں کوزے کو بند کرنے کا امتزاجی منظر دیکھنے کی بجائے یار لوگ اپنے کوزوں میں سے دریا بہانے کے منظر دکھا کر اپنی شعبدہ بازی پر خود ہی بغلیں بجاتے رہ گئے۔

ہماری اردو کی علمی و ادبی دنیا کی خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا جیسی علمی و ادبی شخصیت اسے نصیب ہوئی اور اردو کی ادبی دنیا کی بدقسمتی ہے کہ اس نے ان کی شایانِ شان قدر نہیں کی۔ان کے علمی و ادبی مرتبہ کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ ذاتی و گروہی مفادات آڑے آتے رہے۔

امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر کے فن و شخصیت کی تفہیم میں یہ کتاب کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرے گی۔

حیدر قریشی (جرمنی سے)

مورخہ ۲۸/اگست ۲۰۱۲ء

ابتدائیہ

(ایڈیشن اول)

ڈاکٹر وزیر آغا ہمارے ادب کی عہد ساز شخصیت ہیں۔عہد ساز شخصیت کے الفاظ میں نے محبت یا مروّت میں نہیں لکھے بلکہ ایک حقیقت بیان کی ہے۔یوں ان کی مجموعی ادبی کارکردگی کے اثرات پاکستان اور ہندستان کے ادب پر اتنے نمایاں ہیں کہ سنجیدہ ترقی پسند ناقدین نے بھی برملا طور پر اس کا اقرار کیا ہے تاہم جیسے جیسے وقت گزرے گا ان کے گہرے اثرات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔

ہر بڑے اور اچھے ادیب کی طرح ڈاکٹر وزیر آغا کے مخالفین بھی بے شمار ہیں۔مخالفت کرنے والا ایک طبقہ ایسا ہے جو فکری طور پر ان سے اختلاف رکھتا ہے اور اس اختلاف کا ادبی سطح پر اظہار کرتا ہے۔ایسا اختلاف ادب کے ارتقا کے لئے مفید ہوتا ہے سو ان سے ادبی ڈائیلاگ ہوسکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔دوسرا طبقہ ان مخالفین کا ہے جو حسد اور ذاتی رنجش کے مارے ہوئے ہیں۔حسد تو خیر کبھی بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن ممکن ہے کہ ذاتی رنجش میں بعض لوگ حق بجانب ہوں،ان کے گلے شکوے سچ ہوں یا غلط فہمی کا نتیجہ ہوں۔اس کے باوجود محض ذاتی رنجش کی بنا پر ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی و ادبی خدمات کو منفی رنگ دینے کی کوشش کرنا کوئی صحت مندانہ رویہ نہیں ہے۔اگر دلیل کے ساتھ اور علمی سطح پر اعتراض کئے جائیں تو ایسے لوگوں کے حسد اور ذاتی رنجش کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ مخالفین کا دوسرا طبقہ صرف گالی اور نفرت کی زبان جانتا ہے۔ایسے مخالفین قابلِ رحم ہیں۔ان کے حق میں صرف دعائے خیر کی جاسکتی ہے۔مخالفین کا تیسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کتب کا براہِ راست مطالعہ نہیں کیا۔بعض مخالفین یا اخباری چٹکلوں سے انہوں نے خود ہی ایک تاثر قائم کرلیا۔ایسے لوگوں کو وزیر آغا کی کتب کا

توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا جاسکتا ہے۔

میری یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے گزشتہ دس برس کے دوران ڈاکٹر وزیر آغا کے فن کی مختلف جہات پر وقتاً فوقتاً تحریر کئے ہیں۔جب مجھے انہیں یکجا کرنے کا خیال آیا تب اندازہ ہوا کہ یہ بکھرے ہوئے مضامین الگ الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان سے علم وفن کی کسی سطح کا سہی،ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ایک واضح تاثر سامنے آتا ہے۔

1۔ذاتی شخصیت 2۔بحیثیت نظم نگار 3۔بحیثیت غزل گو 4۔بحیثیت انشائیہ نگار 5۔بحیثیت سوانح نگار 6۔بحیثیت مفکر نقاد 7۔بحیثیت مدیر۔۔۔۔ان ساری حیثیتوں میں ان کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے جو کچھ محسوس کیا اسے مناسب طریق پر لکھ دیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے بعض ذہین مخالفین نے اپنی ذہانت کا مظاہرہ یوں بھی کیا ہے کہ بحیثیت نقاد ان کی اہمیت کو تسلیم کرلیا۔بحیثیت انشائیہ نگار بھی مان لیا لیکن شاعری کے بارے میں دانستہ طور پر غلط فہمیاں پھیلائی گئیں۔شاید اسی وجہ سے اس کتاب میں شامل میرے تین مضامین وزیر آغا کی شاعری سے متعلق ہیں۔مجھے یقین ہے کہ قارئین اس کتاب میں شامل میرے تین مضامین کے ذریعے شاعر وزیر آغا سے مل کر ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوں گے اور پھر براہ راست وزیر آغا کی شاعری کے مطالعہ کا اشتیاق محسوس کریں گے۔نقاد وزیر آغا کو چونکہ اپنے پرائے سبھی مانتے ہیں۔شاید اسی لئے ان کی تنقید نگاری پر زیادہ نہیں لکھ سکا۔میری اس کتاب کا مقصد وزیر آغا کو منوانا نہیں ہے کیونکہ وہ ماننے،منوانے کی سطح سے بہت اوپر ہیں۔اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو لوگ وزیر آغا سے واقف نہیں ہیں،وہ ان سے ملاقات کرسکیں اور جو پہلے سے واقف ہیں وہ ایک نئی ملاقات محسوس کرسکیں۔

حیدر قریشی

(۱۹۹۵ء کی تحریر)

مختصر کوائف ڈاکٹر وزیر آغا

پیدائش 18 مئی	1922
ایم۔اے (معاشیات۔گورنمنٹ کالج لاہور	1943
پی ایچ ڈی (اردو) پنجاب یونیورسٹی	1956
جائنٹ ایڈیٹر 'ادبی دنیا' لاہور	1960 تا 1963
ایڈیٹر 'اوراق'	1965 سے

تصانیف:۔

شاعری

1۔شام اور سائے (نظمیں)	1964
2۔دن کا زرد پہاڑ (نظمیں اور غزلیں)	1969
3۔غزلیں	1973
4۔نردبان (نظمیں)	1979
5۔آدھی صدی کے بعد (طویل نظم)	1981
6۔گھاس میں تتلیاں (نظمیں)1985	
7-اک کتھا انوکھی (غزلیں اور نظمیں)1990	
8۔ چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کل شاعری)	1991
9۔ یہ آواز کیا ہے؟	1995

10- عجب اک مسکراہٹ (نظمیں)	1997
11- چنا ہم نے پہاڑی راستہ (نظمیں)	1999
12-ہم آنکھیں ہیں (نظمیں)نظمیں	2001
13-دیکھ دھنک پھیل گئی (نظمیں)	2003
14-چٹکی بھر روشنی	2005
15-ہوا تحریر کر مجھ کو	2008
16- مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں (منتخب نظمیں	2008
17-واجاں باجھ وچھوڑے (پنجابی نظمیں،غزلیں)	2003
18۔کاسۂ شام (نظمیں)	2011

کلیات

18-غزلیں (1972 تک کی تمام غزلیں)	1973
19-چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (۱۹۹۰ء تک کی تمام نظمیں غزلیں)	1991
20-چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیاتِ غزل،اس مجموعے میں کل غزلیں شامل ہیں)	1991
21-چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (زیرِ طبع کلیاتِ نظم،اس مجموعے میں کل نظمیں شامل ہوں گی)	
22-طویل نظمیں (زیرِ طبع،اس مجموعے میں الگ سے کل طویل نظمیں شامل ہوں گی)	

انشائیہ

1-خیال پارے	1961
2-چوری سے یاری تک	1966

3-دوسرا کنارا 1982

4-سمندر اگر میرے اندر گرے 1989

5- پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (کل انشائیے ایک جلد میں) 1995

6- پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (کل انشائیے، دوسرا ایڈیشن) 2010

تنقید

1-اردو ادب میں طنز و مزاح 1958

2- نظم جدید کی کروٹیں 1963

3-اردو شاعری کا مزاج 1965

4- تنقید اور احتساب 1968

5- تخلیقی عمل 1970

5-نئے مقالات 1972

6-تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں 1977

7-نئے تناظر 1979

8- تنقید اور مجلسی تنقید 1981

9-دائرے اور لکیریں 1986

10۔تنقید اور جدید اردو تنقید 1989

11۔انشائیہ کے خدوخال 1990

12۔مجید امجد کی داستان محبت 1991

13۔ساختیات اور سائنس 1991

14-معنی اور تناظر 1989

15-غالب کا ذوقِ تماشا 1997

16- کلچر کے خدوخال 2009

17-امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر 2006

متفرق

1۔مسرت کی تلاش 1953

2۔تین سفر (سفرنامہ)

3۔شام دوستاں آباد 1976

4۔شام کی منڈیر سے 1986

5۔دستک اس دروازے پر 1994

6۔The Symphony of Existence 1995

تالیفات

1۔1958ء کی نظمیں

2۔1959ء کی نظمیں

3۔1960ء کی نظمیں

4۔1961ء کی نظمیں

5۔عبدالرحمٰن چغتائی۔شخصیت اور فن 1980ء

6۔مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور فن 1990ء

7۔انتخابات جدید نظم (حصہ دوم) انجمن ترقی اردو کراچی 1981ء

دوسری زبانوں میں تراجم

1. Selected poems of Wazir Agha. (English 1978)
2. Half a Century Later (English 1989)
3- Half a Century Later (Danish 1982)
4- A Tale so Starnage (Greek)

5- A Tale so Stange (Svedish 1995)
6- Adhi Sadi Ke bad (Hindi 1983)
7- Adhi Sadi ke Bad (Bangalid 1992)
9- Urdu Shairee Ka Mizaj (Hindi 1983)
10- Baharvan Khilari (punjabi 1985)
11-Adhi Sadi pishoon (Punjabi 1994)
12- Winds Of Free Translated into English 1994
13- Chonvian Nazman (Sarayaki 1980)
14- Seven Poems of Wazir Agha (Translated into English 1995)
15- Selected light Essays(1995)

10۔ وزیر آغا کی بہت سی متفرق نظمیں جرمن، مالٹیز، جاپانی، مراٹھی، ہندی، انگریزی، ہسپانوی، یونانی، ڈینش، اور سویڈش زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

وزیر آغا کے فن پر کتابیں اور رسائل

1۔وزیر آغا ایک مطالعہ	ڈاکٹر انور سدید
2۔شام کا سورج	مرتب ڈاکٹر انور سدید
3۔الزبیر (وزیر آغا نمبر)	مرتب شہاب دہلوی
4۔آوازِ جرس (وزیر آغا نمبر)	مرتب ظفر معین، افتخار، ایلی
5۔سکائی لارک انٹرنیشنل (وزیر آغا نمبر)	مرتب بلدیو مرزا
6۔معاصرین کی نظر میں	مرتب سجاد نقوی
7۔دن ڈھل چکا تھا (وزیر آغا کی شاعری پر تنقید)	ناصر عباس نیّر

دیگر کتب

1۔وزیر آغا کے دیباچے مرتب ڈاکٹر سید احسن زیدی
2۔پہلا ورق (اوراق میں وزیر آغا کے اداریے) مرتبہ حیدر قریشی، راغب شکیب
3۔وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام مرتبہ ڈاکٹر انور سدید
4۔مکالمات (وزیر آغا سے) مرتبہ ڈاکٹر انور سدید

5۔وزیر آغا کی نظمیں (انتخاب)	ڈاکٹر غلام حسین اظہر
6۔وزیر آغا کے خطوط	اکبر حمیدی
7- ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت	حیدر قریشی

وزیر آغا پر جامعات میں کام

1۔بہار یونیورسٹی (بھارت) میں ڈاکٹر عبدالواسع کی نگرانی میں پی ایچ ڈی مقالہ:
عنوان ''وزیر آغا کا فن''
2۔پٹنہ میں وہاب اشرفی کی نگرانی میں پی۔ایچ ڈی کا مقالہ: ''وزیر آغا کی تنقید''
3۔مارواڑی کالج بھاگلپور میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ:
''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری''۔
4۔جے پور یونیورسٹی میں ڈاکٹر فیروز احمد نگرانی میں ایم فل کا مقالہ:
''وزیر آغا کی تنقید نگاری''۔
5۔''وزیر آغا کی شاعری: پنجاب یونیورسٹی ایم اے کا مقالہ۔
6۔''وزیر آغا کی شاعری: پنجاب یونیورسٹی ایم اے کا مقالہ۔
7۔وزیر آغا کی تنقید: پنجاب یونیورسٹی ایم اے مقالہ
8۔وزیر آغا کی اقبال شناسی: اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ایم اے کا مقالہ
9۔وزیر آغا کی انشائیہ نگاری: اسلامیہ یونیورسٹی پشاور ایم اے کا مقالہ
10۔وزیر آغا کے انشائیے: اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

وفات: ۸/ستمبر ۲۰۱۰ء

عہد ساز شخصیت

(ڈاکٹر وزیر آغا)

جو اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا
سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا

میرا پہلا مضمون ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ ''نگار پاکستان'' کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا ''موجودہ ادبی بے راہ روی'' اس مضمون میں، میں نے ''ادب میں نیک مقصدیت'' کے تصور کو ادب کے لئے مضر سمجھا تھا اور ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب دونوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ تب میں ادبی دنیا میں نو وارد تھا اور جدید اردو ادب کا میرا مطالعہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ تاہم ادب کے بارے میں میرے تصورات مبہم اور غیر واضح ہونے کے باوجود میرے اندر کی کسی طلب کے ترجمان تھے۔ اسی دوران مجھے ''تنقید اور احتساب'' پڑھنے کا موقعہ ملا تو یوں لگا میرے مبہم اور غیر واضح تصورات کو اصل صورت ملنے لگی ہے۔ یہ ڈاکٹر وزیر آغا سے علمی سطح پر میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ''نظم جدید کی کروٹیں'' اور ''نئے مقالات'' کے ذریعے ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید دو ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ میں سوچتا ہوں مگر میری گرفت میں نہیں آپاتا وہ سب ڈاکٹر وزیر آغا کی گرفت میں ہے۔ بقول غالب:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۷۸ء کے آخر میں ''جدید ادب'' کتابی سلسلے کے اجراء کا پروگرام بنا۔ میں خانپور سے

چل کر لاہور آیا۔ علی اکبر عباس پہلے ادیب تھے جو بڑی محبت سے ملے۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ ٹی وی سنٹر اور پاک ٹی ہاؤس کی یاترا کرائی۔ لاہور کے ادیبوں سے نگارشات لے کر دیں۔ ''جدید ادب'' کے اولین کرم فرماؤں میں سراج منیر، اقبال ساجد، اسلام عظمی، خالد احمد اور بعض دیگر ادباء شامل تھے۔ علی اکبر عباس کے توسط سے ہی ان ادباء نے اپنی تخلیقات عطا کی تھیں۔ ''جدید ادب'' کا پہلا شمارہ چھپا۔ ادباء کی خدمت میں بھیجا گیا مگر اہل لاہور نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اسی دوران ڈاکٹر انور سدید کا ایک انٹرویو روزنامہ ''جسارت'' کراچی کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو کے ساتھ ان کا پتہ بھی درج تھا۔ میں نے انہیں خط لکھا اور ممکنہ حد تک قلمی معاونت کی درخواست کی۔ میں نے انور سدید کو خط کیا لکھا گویا دبستاں کھل گیا۔

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

ڈاکٹر انور سدید نے مجھے لاہور کے چکروں سے نجات دلا دی۔ ادبی تحریروں کے حصول کے لئے اچھے اچھے ادیبوں کے پتے فراہم کئے۔ ان میں وزیر آغا بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے میری معمولی سی درخواست پر جس محبت کے ساتھ اپنی نگارشات عطا کیں مجھے اس پر خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔ ''جدید ادب'' کے اجراء کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بڑے شہروں کے ادیبوں کی اجارہ داری کے باوجود چھوٹے شہروں کے ٹیلنٹ کو بھی سامنے آنے کا موقعہ ملنا چاہئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اہل سرگودھا بھی ہماری طرح لاہوری ادیبوں کی اجارہ دارانہ ذہنیت کا شکار ہیں اور کئی برس سے علمی اور تخلیقی سطح پر مصروف جہاد ہیں۔

اس تمہید طولانی سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے میرا تعلق کسی تعارف کے بغیر فکری سطح پر پہلے قائم ہوا تھا۔ ذاتی رابطہ اور شخصی سطح پر تعلق بہت بعد میں قائم ہوا۔ میں نے وزیر آغا سے اپنے تعلق اور نیاز مندی کو دو خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک خانہ علمی اور فکری تعلق کا ہے۔ ایک خانہ شخصی اور ذاتی تعلق کا ہے۔ علمی لحاظ سے میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنا استاد اور رہنما سمجھتا ہوں۔ ان کی تنقید اور فکر سے میں نے ادبی رہنمائی حاصل کی ہے۔ میں نے افسانے

لکھے تو انہوں نے قدم قدم پر مجھے شاباش دی۔ حوصلہ افزائی کی۔ مفید مشورے دیئے۔ کبھی کبھی بعض مشوروں سے مجھے الجھن بھی ہوتی تھی۔ ابھی میں نے چند افسانے لکھے تھے جو زیادہ تر ''اوراق'' میں چھپ جاتے تھے۔ افسانہ ''پتھر ہوتے وجود کا دکھ'' میں نے ''اوراق'' کے لئے بھیجا تو وزیر آغا نے مجھے خط لکھا: اگر آپ اسی انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صف اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں نے احتیاطاً اپنا انداز بدل لیا تاکہ صف اول کے جدید افسانہ نگاروں میں شامل ہو کر اپنا حشر بھی ان جیسا نہ کرالوں۔ وزیر آغا نے مجھے انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ وزیر آغا سے رابطہ ہوا تو مجھے پہلی بار ماہنامہ ''اردو زبان'' میں شائع شدہ نظم ''دھوپ'' کے ذریعے شاعر وزیر آغا سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ سردیوں کے موسم میں یہ نظم پڑھی تھی۔ مسرت اور حیرت کی ایک انوکھی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ میں شاعری کے ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوا۔ پھر ''واپسی'' اور ''سمندر اگر میرے اندر گرے'' نظمیں پڑھیں اور میں وزیر آغا کی نظموں کا ہمیشہ منتظر رہنے والا قاری بن گیا۔ میرے نزدیک وزیر آغا کی نظم میں جو جہانِ دیگر ہے وہ اس عہد کے کسی بھی دوسرے نظم نگار کو نصیب نہیں ہوا۔

شخصی سطح پر قلمی رابطے کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا ۱۹۷۹ء کے اواخر میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے رحیم یار خاں تشریف لائے۔ خانپور بھی آئے۔ تب ان سے ملاقاتیں ہوئی۔ پہلی ملاقات کے وقت میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ میں اس عہد کی اک بہت بڑی ادبی اور علمی شخصیت سے ملنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں۔ پھر کبھی بہاولپور، کبھی لاہور اور کبھی سرگودہا میں ان سے ملاقاتیں ہوئی اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا میں ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ عالمی ادب اور بالخصوص انگریزی ادب کی رفتار سے باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے بھی انگریزی کتب پڑھانے کی کوشش کی لیکن ان کے چکر میں آئے بغیر میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ انگریز کی برصغیر پر سوسالہ غاصبانہ اور ظالمانہ حکمرانی کے

باعث میں انگریزی زبان سے محبت نہیں رکھتا (انگریز خواتین اس سے مستثنیٰ ہیں)۔ دوسرے یہ کہ میری انگریزی اسکول کے زمانہ سے ہی اتنی خراب رہی ہے کہ انگریزی کتب پڑھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ سو انہیں اندازہ ہو گیا کہ انگریزی زبان سے میری واقفیت کا حال ان کے ''بھائیے'' جیسا ہے۔ چنانچہ پھر انہوں نے مجھے اس چکر میں الجھانا مناسب نہیں سمجھا ۔۔ ۔۔

وزیر آغا سے دوستی اور فکری ہم آہنگی نے مجھے عملی زندگی میں شدید نقصان بھی پہنچایا ہے۔ میں پہلے ہی سے کچھ صوفیانہ فکر و خیال کا آدمی تھا، اوپر سے وزیر آغا نے دنیا سے بے نیازی اور ادب کو ہی اولیت دینے کا اتنا اظہار کیا کہ میں نے دنیا اور اس کی محبت کو بہت ہی حقیر سمجھ لیا۔۔ بچے بڑے ہوئے۔ سکول، کالج تک پہنچے۔ اخراجات بڑھے۔ مہنگائی بڑھی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔ تب پتہ چلا کہ دنیا سے اتنی بے نیازی بھی اچھی نہیں۔۔۔ دنیا سے بے نیازی اسی وقت اچھی لگتی ہے جب گھر میں کھانے پینے کے وافر اسباب موجود ہوں ورنہ انسان کا وہی حشر ہوتا ہے جو میرا ہوا۔

وزیر آغا کے بہت سے دوست بنے۔ کچھ چند قدم چل کر جدا ہو گئے۔ بعض نے لمبی رفاقت کے بعد جدائی اختیار کر لی۔۔ بعض دوست غلام جیلانی اصغر، انور سدید، غلام الثقلین نقوی، صابر لودھی اور سجاد نقوی کی طرح دوستی نبھانے والے نکلے۔۔ جدا ہونے والوں میں سے کچھ لوگ جدا ہو کر خاموش ہو گئے۔۔ کچھ نے مخالفت پہ کمر باندھ لی۔۔ ایسا کیوں ہوا؟

میں یک طرفہ بے لوث اور بے غرض محبت کو نہیں مانتا۔ محبت ہمیشہ دو طرفہ ہوتی ہے۔ محبت بجائے خود ایک ایسا جذبہ ہے جو تسکین کی غرض رکھتا ہے۔ اس لئے میں یہ نہیں مانتا کہ وزیر آغا کو چھوڑ جانے والے لوگ محض اغراض کے بندے تھے۔ اصل خرابی یہ تھی کہ شدید محبت کے باعث وزیر آغا سے ان کی توقعات بہت بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ جب ان توقعات کو ٹھیس پہنچی تو جدائی واقع ہو گئی۔۔ جدائی کے بعد بعض صاحبان خاموش ہو گئے اور بعض نے مخالفت پر کمر باندھ لی یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

وزیر آغا دشمن کے تیر سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر دوستوں کے مارے ہوئے پھول نہیں سہہ

سکتے۔ ہاں اگر دوست کھل کر دشمن بن جائے تو پھر اس کی زہریلی مخالفت کو بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گھول کر پی جاتے ہیں۔ سطحی قسم کے مخالفین کے انداز مخالفت پر انہیں غصہ نہیں آتا بلکہ مخالفوں کی ذہنیت پر رحم آتا ہے۔ البتہ جو لوگ مکارانہ اور سازشی انداز اختیار کرتے ہیں ان کے رویّے پر وزیر آغا کو افسوس بھی ہوتا ہے اور رنجیدہ بھی ہوتے ہیں۔۔ علمی اور فکری اختلاف رائے کو وزیر آغا نے ہمیشہ کشادہ بازؤں کے ساتھ سینے سے لگایا ہے۔ مخالفت کی آندھیوں اور دشمنی کے سیلابوں کے پے در پے حملے سہنے کے باوجود اور اپنی عمر کے ستر برس عبور کر لینے کے بعد بھی وزیر آغا باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ شگفتگی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔۔ لطیفہ بازی، ہنسنے ہنسانے کا اکتسابی عمل ہے۔ لطیفہ باز ادیبوں پر بعض اوقات اس کا اتنا گہرا اثر پڑتا ہے کہ ان کی تخلیقات بھی اکتسابی عمل دکھائی دینے لگتی ہیں۔ لطیفہ بازی کی کئی عبرتناک مثالیں لاہور میں موجود ہیں۔ وزیر آغا لطیفہ باز ہیں نہ جملہ باز۔۔ وہ تو جملہ تخلیق کرتے ہیں اور اس میں ایسا بے ساختہ پن ہوتا ہے کہ نشانہ بننے والا بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ ان کے جملے میں ڈنک نہیں ہوتا۔

عام طور پر مجلسوں میں ہنسنے ہنسانے والوں کا علم کا خانہ خالی ہوتا ہے مگر وزیر آغا ایک طرف شگفتگی اور خوش مزاجی کا سمندر ہیں تو دوسری طرف علم کا بحر ذخار ہیں۔ میں نے نجی گفتگو میں بھی وزیر آغا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ الٰہیاتی مسائل، روح کی حقیقت، انسان کی مخفی قوتیں اور کائنات کی بے پناہ وسعتیں۔۔ ان موضوعات پر ان سے کھل کر باتیں کی ہیں۔ بعض ایسی باتیں جو اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی کبھی کبھار خوف محسوس ہوتا ہے وزیر آغا سے بے خوف ہو کر کی ہیں اور ان کی گفتگو سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ان کے گاؤں وزیر کوٹ میں کھیتوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے بھی دیکھے ہیں اور آسمان پر ڈوبتے سورج کا منظر بھی دیکھا ہے۔۔ طویل و عریض کھیتوں میں کھڑے ہو کر میں نے یہ تجربہ بھی کیا کہ کس طرح معمولی سا زاویہ بدلنے سے سامنے کا سارا منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس سے کائنات کی نیرنگیوں کا اندازہ ہوا۔

وزیر آغا نے ایک دو بار میرے گھر کو بھی اپنی آمد سے رونق بخشی۔ ایک دفعہ اباجی کی زندگی

میں آئے۔ اباجی اور وزیر آغا کی مختصر سی ملاقات ہوئی۔ اباجی کسی اور لائن کے آدمی تھے لیکن وزیر آغا کے جانے کے بعد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے بھئی تمہارے وزیر آغا کی آنکھوں میں بڑی انوکھی چمک ہے اور اس کے چہرے پر کسی روشنی کا ہالہ سا محسوس ہوتا ہے اباجی کی ملاقات و۔ع۔خ سے ہوتی تو شاید کچھ ایسی صورت بنتی:

اس نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا یہ ہے\
میں نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے\
اور پھر آئینے اک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے\
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے!

وزیر آغا کو سائنسی انکشافات اور طبیعات کے مضمون سے بڑی دلچسپی ہے۔ طبعیات پر ان کی معلومات اتنی تازہ ترین ہے کہ میرے ایک عزیز اور طبیعات کے پروفیسر ادریس احمد اس بارے میں بار بار حیرت کا اظہار کرتے رہے ہیں اور تا حال ان کی حیرت ختم نہیں ہوئی۔

جو لوگ مختلف علوم کے ادب کے ساتھ ربط کی نوعیت کو جاننا چاہتے ہیں انہیں وزیر آغا کی کتب ضرور پڑھنی چاہئیں اور طلب زیادہ ہو تو ملاقات بھی کرنی چاہئے۔ علم کے جو ایسے دلدادہ تا حال وزیر آغا کی کتابیں نہیں پڑھ سکے یا ان سے ملاقات نہیں کر سکے ان کے بارے میں یہی کہوں گا:

افسوس تم کو میؔر سے صحبت نہیں رہی

اردو انشائیہ کے بانی، جدید تر نظم کے پیش رو، اردو تنقید کی منفرد اور عالمانہ آواز۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت ہیں۔ اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوجود ہمارے ادب اور ہمارے عہد کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے ان سے اکتساب علم اور نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔

☆☆☆

شام کی منڈیر سے

وزیر آغا کی سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' شائع ہوئی ہے تو اس سے عام قارئین کے لئے وزیر آغا کی زندگی کے کئی پہلو سامنے آ گئے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے پس منظر سے وزیر آغا کی تخلیقات کا ایک نیا جہانِ معنی طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔

میں وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' کا ایک ایسا قاری ہوں جو ایک عرصہ تک اس نظم کے اقتباسات مزے لے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ میں اس نظم پر تفصیل سے لکھنے کا متمنی تھا (اور ہوں) لیکن اس کا شعری حسن اتنا مسحور کر دیتا ہے کہ میں سرتا پا ایک لطیف تاثر میں بھیگ جاتا ہوں اور یوں ابھی تک اس کے تجزیہ کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ ''شام کی منڈیر سے'' میں ''آدھی صدی کے بعد'' کی بہت ساری باتیں نثری پیرائے میں کی گئی ہیں بلکہ ایسے احوال جو نظم میں اشارتاً بیان ہوئے تھے نثر میں بالتفصیل آ گئے ہیں۔

وزیر آغا نے اپنے بچپن کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے شرمیلے پن کی کہانی بیان کی ہے۔

''میں بچپن میں بہت شرمیلا تھا۔ میرا خیال ہے اس کی بڑی وجہ جسمانی کمزوری تھی......اگر جسم کمزور ہو تو انسان خود میں سمٹ جاتا ہے''۔

''میں نہایت مؤدب، کم گو اور شرمیلا تھا۔ اس قدر کہ اسکول کی سالانہ تقریبِ انعامات میں مجھے ''خاموشی'' کا انعام ملا۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت برا ہوا کیونکہ خاموش رہنے کا انعام پا کر میں نے سوچا کہ یہ کوئی بہت بڑا وصف ہے۔ چنانچہ میں مزید خاموش ہو گیا۔ اور میری فطری جھجک مجھے خاموش پا کر مزید دلیر ہو گئی''۔

شرمیلے پن کے باعث وزیر آغا کو ابتدائی زندگی میں یقیناً بہت سی چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے

واسطہ رہا ہوگا۔ لیکن اسی شرمیلے پن کے باعث ان کے ہاں اندر کی غواصی کا عمل شروع ہوا، جو اس درجہ مستحکم ہوا کہ اس کا حاصل وزیر آغا کی تصنیفات کی صورت میں ہمارے ادب کا ایک گراں قدر حصہ بن چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وزیر آغا ایک عام سطح کے ترقی پسند ادیب ہوتے، جس کی نگارشات محض بیرونی جبر کے زیر اثر رہتیں۔ خود میں سمٹنے اور اندر کی غواصی کا نتیجہ تھا کہ وزیر آغا کو اندر کی کائنات کے وسیلے سے باہر کی کائنات کو ممکنہ حد تک سمجھنے اور زندگی کو وسیع تر مفہوم میں جاننے کا وژن نصیب ہوا۔

''شام کی منڈیر سے'' کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سے ایسے اعتراضات کی گرد بھی صاف ہوتی ہے جو مخالفت برائے مخالفت کے طور پر وزیر آغا کے خلاف اڑائی جاتی رہی ہے۔ اس میں جاگیرداری سے لے کر دھرتی پوجا تک کے سارے جاہلانہ اعتراضات کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ ایسے اعتراضات میں سے ایک اعتراض و۔ع۔خ کی شخصیت کے روحانی اور علمی تعارف پر ہوتا ہے۔ ''شام کی منڈیر سے'' میں وزیر آغا نے و۔ع۔خ کو جس انداز میں پیش کیا ہے اسے پڑھ کر میری ذاتی رائے یہ تھی کہ اچھے بیٹے نے اپنے مرحوم والد کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی اچھے انداز میں کر دیا ہے۔ میں نے اپنی یہ رائے اپنے ایک دوست کو بتائی تو انہوں نے ایک عجیب کہانی سنا ڈالی۔ ان کے بقول ان کی اہلیہ نے (جو اَب ایک کالج میں وائس پرنسپل ہیں) ایم اے فلسفہ کے ایک پرچے میں ''ویدانت کا مطالعہ'' لیا تھا۔ امتحان سے کچھ عرصہ قبل وہ اپنی اہلیہ کو وزیر کوٹ و۔ع۔خ کے پاس لے گئے اور مدعا بیان کیا۔ انہوں نے دو گھنٹے تک لیکچر دیا۔ بعد میں ان کی بیگم کا کہنا تھا کہ ایم اے کی تیاری کے دو سال ایک طرف اور و۔ع۔خ کے دو گھنٹے کا لیکچر ایک طرف۔ و۔ع۔خ واقعی کوئی روحانی اور علمی شخصیت تھے اور وزیر آغا نے یقیناً محض سعادت مند بیٹے کا فرض پورا نہیں کیا۔

''شام کی منڈیر سے'' ادب کے ان قارئین کے لیے گائیڈ بک کا کام بھی کرتی ہے جنہیں عام طور پر یہ شکایت ہے کہ وزیر آغا کی شاعری پوری طرح انہیں سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے اگر ایسے قارئین ایمانداری سے ''شام کی منڈیر سے'' پڑھ لیں تو ان کی عدم تفہیم کی شکایت نہ صرف

دور ہو جائے گی بلکہ انہیں وزیر آغا کے تصورات کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔ان تصورات کو سمجھنا یا نہ سمجھنا پھر ان کی اپنی ذہنی استعداد یا نیّت پر منحصر ہے۔

وزیر آغا نے کتاب کے آغاز میں وضاحت کی ہے کہ انھوں نے مجموعی طور پر اکیس کتابیں نہیں لکھیں بلکہ ایک ہی کتاب لکھی ہے۔ اگر چہ ہر کتاب کی اپنی جگہ ایک مکمل کہانی ہے، مگر ساری کتابیں مل کر بھی ایک کہانی بناتی ہیں۔۔۔کتاب کے اندر وزیر آغا نے اپنے فکری ارتقا کے بارے میں خود نشاندہی کی ہے۔ میں نے وزیر آغا کو ان تمام تصنیفات کے مجموعی تاثرات کے ساتھ غور سے پڑھا تو مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ وزیر آغا کے ہاں ایک مثلث نمایاں ہے۔ یہ مثلث روحانیت، سائنس اور ادب سے عبارت ہے۔ روحانیت میں حضرت ابراہیمؑ، کرشن، گوتم، حضرت نوحؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسف کی زندگیوں سے لے کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج تک کے واقعات اور تلمیحات کو وزیر آغا نے ایک طرف سائنٹیفک انداز سے پیش کیا ہے تو دوسری طرف ان کے تخلیقی پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ الٰہیاتی تصورات کی اپنی ایک نرالی شان ہے جس میں خدا کے بے انت اور لامحدود ہونے کا ایک انوکھا تصور ابھرتا ہے۔

سائنس کو وہ اس کے وسیع تر مفہوم میں لیتے ہیں اور کائناتِ اصغر کی نئی نئی دریافتوں سے خوش گوار حیرتوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔علم الحیات۔ زندگی کی ابتدا، عالمِ موجود، ایٹم، وقت کی ماہیت، نظام شمسی، کھربوں ستاروں پر مشتمل کہکشائیں، لاکھوں کروڑوں کہکشائیں اور بلیک ہولز۔

روحانیت اور سائنس کے حیرت افزا انکشافات کو وہ ادبی زاویے سے بھی دیکھتے ہیں اور اپنی تخلیقات کو ان سے منور بھی کرتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں ادب محض حسن و عشق کا بیان یا محض احتجاج نہیں بلکہ وہ تو زندگی اور کائنات کے بے شمار اسرورموز کی نقاب کشائی کا موجب بنتا ہے۔ پھر وہ اپنے ادبی کشف کو اپنے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنے قارئین کو بھی اس کی حیرتوں اور مسرتوں میں شریک کرتے ہیں۔

اگر کوئی ایسا شخص جسے صرف روحانیت سے دلچسپی ہو اس کتاب کو پڑھے گا تو نہ صرف اپنی دلچسپی کا بہت سارا سامان اس میں پائے گا، بلکہ سائنس اور ادب سے بھی اس کی موانست پیدا ہو

جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی سائنس سے دلچسپی رکھنے والا اسے پڑھے گا تو خود بخود سائنسی انکشافات میں ایک روحانی اسرار محسوس کرنے لگے گا۔ میں خود ادب کا ایک حقیر طالب علم ہوں لیکن اس کتاب کے مطالعہ نے نہ صرف نئی سائنسی معلومات کے باعث مجھے بارہا حیرت زا مسرت سے دو چار کیا ہے، بلکہ روحانی سطح پر بھی میرے اندر ایک تبدیلی پیدا کی ہے۔ میرے الٰہیاتی تصورات میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اور پھر ایک نئی تعمیر کا عمل بھی جاری ہوا ہے۔ میرے قریبی دوست میری ان ذہنی کیفیتوں کا حال بخوبی جانتے ہیں۔

انسانی طبائع پر اس درجہ اثر انداز ہونے والی یہ کتاب اس کے باوجود نہ محض فلسفے کی کوئی کتاب ہے، نہ سائنس کی، نہ روحانیت کی کتاب ہے نہ نفسیات کی...... یہ تو صرف ڈاکٹر وزیر آغا کی کہانی ہے۔ اپنی کہانی جسے انھوں نے دوسروں کو سنانے کی بجائے خود سننے کی سعی کی ہے۔ اور جو ایک محدود سطح پر میری بھی کہانی ہے۔ کتاب کا اندازِ تحریر بے حد شگفتہ ہے۔ کہیں کہیں پھلجھڑیاں چھوٹتی بھی نظر آتی ہیں:

''ایک لڑکا سامنے کھڑا ہو کر زور زور سے ''ایک دونی دونی، دو دونی چار'' کا آوازہ لگاتا اور اس کے جواب میں سکول کے سارے لڑکے اپنی پوری قوت سے پہاڑے کو دہراتے۔ ہماری آوازوں میں عجیب سا طنطنہ ہوتا، جس میں فریق مخالف کی آواز سے سبقت لے جانے کی کوشش کے ساتھ سکول کی قید سے رہائی پانے کی مسرت بھی شامل ہوتی''۔

''ہر کسان کے پاس ایک کچا کوٹھا تھا جس میں بکری، بیل، بھینس، کتا اور اس کا کنبہ رہائش پذیر تھے۔ بچوں کے آگے شب و روز ''تماشہ'' ہوتا رہتا تو وہ قبل از وقت ہی بلوغت کی خوشبو سونگھ لیتے اور پھر اخلاقیات کا منہ چڑانے لگتے''۔

''عارف عبدالمتین صاحب کا ایک اپنا حلقہ بھی تھا جسے لوگ '' ادب کا چشتیہ ہائی سکول'' بروزن'' ادب کا لکھنؤ سکول'' کہہ کر پکارتے تھے''۔

''میں ایک صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان سے ملوا دیجئے...... گوپی چند نارنگ بولے: کہئے کہئے ابھی ملوائے دیتے ہیں...... میں نے کہا:

ان صاحب کا نام ہے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ! بس اسی لمحے سالن کی پلیٹ سمیت مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔''

شگفتگی کے ساتھ ساتھ بعض جگہوں پر طنز بھی نمایاں ہو جاتا ہے لیکن بغور دیکھیں تو اس طنز میں گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی شامل ہوتا ہے۔ مثلاً زمینداری کے معاملات میں سنڈیوں کا حال بتاتے ہوئے بعض اہم تہذیبی اور مروج ادبی رویوں کی بھی نشاندہی کر جاتے ہیں:

''پیلے رنگ کی سنڈی کا انداز کمیونسٹوں ایسا تھا۔ وہ پھلوں میں داخل ہوتی تو اوپر سے پھول کی پتیوں کو جوڑ کر ایک خیمہ سا بنا لیتی۔ ٹینڈے میں نہ جانے کس طرح داخل ہوتی کہ بظاہر ٹینڈا اصاف ستھرا اور بیماری سے محفوظ دکھائی دیتا، مگر جب توڑا جاتا تو وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوتا......امریکی سنڈی کے مزاج میں ساری امریکی تہذیب سمٹی ہوئی تھی۔ وہ جب ٹنڈے پر حملہ کرتی تو اس کے اندر کی ساری غلاظت ٹینڈے کے اوپر چپک جاتی۔ دور ہی سے نظر آ جاتا کہ امریکی سنڈی اپنے کام میں مصروف ہے۔ تیسری سنڈی چتکبرے رنگ کی تھی اس میں باقی دونوں سنڈیوں کے خصائص یکجا ہو گئے تھے، مگر اس کا رویہ زیادہ تر منافقانہ تھا۔ اس میں پاکستان کے چتکبرے افراد کا رویہ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔''

بعض جگہوں پر وہ خود کو بھی طنز کی زد پر لے آتے ہیں۔ لیکن......(لیکن سے پہلے ایک دلچسپ اقتباس!)

''میرا بھتیجا نجابت مجھ سے عمر میں دو سال بڑا لیکن تعلیم میں ایک سال پیچھے تھا۔ میں گو عمر میں اس سے چھوٹا تھا لیکن وہ ہمیشہ مجھے ''چچا جان'' کہہ کر مخاطب کرتا اور اپنے نجی معاملات کے ضمن میں بھی مجھ سے رہنمائی حاصل کرنے کا طالب ہوتا۔ مثلاً ایک روز میرے پاس آیا اور کہا:

''چچا جان! مجھے بتاؤ میں کیا کروں سبھی لڑکیاں مجھے اچھے لگنے لگی ہیں۔ انتخاب مشکل ہو گیا ہے''

......جواباً میں نے نہایت سنجیدگی سے اس پر پند و نصائح کی بوچھار کر دی۔ کہا کہ ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔ اسے انسانی اخلاقیات پر بھرپور لیکچر دیا اور پھر برے اعمال کے نتائج سے اسے آگاہ

کرنے کے لئے جہنم کا نقشہ اتنی تفصیل کے ساتھ کھینچا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے میں خود ابھی ابھی وہاں سے آیا ہوں۔ میرے لیکچر کو سن کر وہ مسکرایا اور کوئی فلمی گیت گنگناتا ہوا باہر چلا گیا۔ میری نصیحتوں کا اس پر کوئی اثر مرتسم نہیں ہوا تھا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ بات وہی اثر کرتی ہے جو دل سے نکلتی ہو۔ دوسری طرف میں خود بھی ان دنوں اس کی حالت زار سے ملتی جلتی کیفیت سے گزر رہا تھا۔''

بظاہر وزیر آغا نے خود پر طنز کیا ہے لیکن درحقیقت اپنے وسیلے سے ہمارے پورے معاشرے کے منافقانہ کردار کو بے نقاب کیا ہے۔ بالخصوص ہماری آٹھویں دہائی کے معاشرے کو۔

دہلی کے افسانہ سیمینار کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود صرف یہی بات اس کی رسوائی کا موجب بن گئی تھی کہ اس میں جوگندر پال جیسے بڑے افسانہ نگار کو دیدہ دانستہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جب اس سیمنار کی روداد پاکستان پہنچی تو اس ادبی بددیانتی کے خلاف میں نے آواز اٹھائی تھی۔ جدید ادب کے جوگندر پال نمبر کے ابتدائیہ میں بھی اس کی مذمت کی گئی تھی۔ بعد میں متعدد ادباء نے ہمارے موقف کی تائید کی۔ وزیر آغا اس سیمینار میں پاکستانی وفد کے سربراہ تھے۔ انہوں نے اب اپنی اس کتاب میں برملا طور پر جوگندر پال کے فن اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے اور افسانہ سیمینار میں انہیں نظر انداز کئے جانے پر حیرت کا اظہار بھی۔

''میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جوگندر پال کو افسانہ سیمینار کے کسی سیشن میں افسانہ سنانے کی دعوت نہیں ملی تھی۔ حالانکہ وہ اردو افسانہ نگاری میں اتنے زیادہ اہم ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔''

غلام جیلانی اصغر نے وزیر آغا کے بارے میں لکھا تھا

''وزیر آغا کی دوستی کے کئی در ہیں۔ وہ آدمی پر اپنا ساتواں در وا نہیں کرتا۔ (اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہئے)''

میرا خیال ہے وزیر آغا نے اپنا ساتواں در کسی پر بھی وا نہیں کیا۔ ''شام کی منڈیر سے'' میں بھی یہ در کھلتا نظر نہیں آتا۔ البتہ اس در کی جھری میں سے دیکھنے کا انداز ضرور ابھرتا ہے۔ اس در کے باہر وہی شرمیلا بچہ بیٹھا ہے جس نے وزیر آغا کو خود میں سمٹنے اور اندر کی غوّاصی کرنے کا سلیقہ بخشا تھا۔ یہ

اسی بچے کے شرمیلے پن کا اعجاز ہے کہ ہمارے ادب میں جمالیاتی قدروں کے ساتھ ایک فرقۂ باطنیہ ظہور میں آچکا ہے جس کے امام وزیر آغا ہیں۔۔ادب کے اس فرقۂ باطنیہ کے باطن کا تعلق سلطان باہوؒ کے باطن جیسا ہے جسے ساتواں در بھی کہہ سکتے ہیں۔

دراصل ساتواں در لازماں اور لامکاں کی طرف کھلتا ہے۔طور پر پڑنے والی تجلی کی طرف کھلتا ہے۔اسے براہ راست کھلی آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے منظر کی تیز روشنی آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے اور ہوش وحواس تک گم ہوجاتے ہیں۔

وزیر آغا اس حقیقت سے آگاہ ہیں اسی لیئے انہوں نے لوگوں کے سامنے، دوستوں کے سامنے اپنا ساتواں در بند ہی رکھا ہے۔لیکن اندر کے منظر کی روشنی جو کبھی دروازے کی جھریوں سے باہر کو لپکتی ہے۔اور کبھی تھوڑا سا پٹ کھلنے پر باہر کو امنڈ آتی ہے اسے وزیر آغا کی تخلیقات میں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔۔۔ڈاکٹر انور سدید، غلام جیلانی اصغر اور مجھ سمیت بہت سارے وزیر آغا کے دوستوں اور نیاز مندوں کو ان کے چہرے پر روشنی کو جو ہالہ نظر آتا ہے وہ ان کے ساتویں در کی جھلک ہی تو ہے۔

’’شام کی منڈیر سے‘‘ اپنے اسلوب کے لحاظ سے سوانح عمری، سیاحت نامہ اور سفر نامہ نگاری کا خوبصورت امتزاج ہے۔وزیر آغا نے عمرِ رفتہ کو آواز نہیں دی بلکہ اب تک کی بیتی ہوئی زندگی کے نہاں خانے میں اپنے سارے سفر کو دہرایا ہے۔

یہ سفر کہیں ایک مسافر کے انداز میں سر ہوا ہے تو کہیں کسی سیاح کے روپ میں۔

دو نظموں کا مطالعہ

وزیر آغا کی طویل نظم ’’آدھی صدی کے بعد‘‘ آج سے نو سال پہلے شائع ہوئی تھی اس نظم کو میں نے کئی بات پڑھا اور ہر بار ایک نیا لطف اٹھایا اس کا تاثراتی سحر ایسا تھا کہ میں اس سے لطف اندوز تو ہوا مگر کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کوئی مضمون لکھنے سے قاصر رہا۔اب وزیر آغا کی ایک اور طویل نظم ’’اک کتھا انوکھی‘‘ چھپ کر آئی ہے تو یوں لگا ہے جیسے میں اب ’’آدھی صدی کے بعد‘‘ پر مضمون لکھنے کی خواہش پوری کر سکوں گا۔

’’آدھی صدی کے بعد‘‘ وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ہے جبکہ ’’اک کتھا انوکھی‘‘ منظوم جگ بیتی ہے آپ بیتی کا کمال یہ ہے کہ اس میں جگ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔جبکہ موجودہ جگ بیتی کا کمال یہ ہے کہ اس میں آپ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔دونوں نظموں کے سفر اندر کے رستے سے طے ہوئے ہیں۔’’آدھی صدی کے بعد‘‘ میں پانی کا دھارا ایک تمثیل کے طور پر آیا ہے جو جھرنا، ندی اور دریا کے چینل سے گزر کر سمندر کا روپ بنتا ہے۔’’اک کتھا انوکھی‘‘ میں بھی ابتداً پانی کے طوفان کا ذکر آیا ہے:

’’تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
پہلے بھی اک ایسا ہی
طوفاں آیا تھا
تب اک بیج کی کشتی میں تُو
پانی کی شکنوں پر چلتا
ایک پہاڑ پہ جا پہنچا تھا

ایک نیا انکھوا

پھوٹا تھا

ایک نیا سورج نکلا تھا''

لیکن اس سے آگے چلیں تو اس عہد کا المیہ رونما ہوتا ہے، پانی کی جگہ آگ لے لیتی ہے:

''آج وہی طوفان

نئے انداز میں ہم پر ٹوٹ پڑا ہے

لیکن اب کی بار یہ طوفاں

اگنی کا ہے

جلے ہوئے کیسر کے ڈنٹھل

شعلوں کے گرداب

ہوا کا شور

گھنے بادل کے تن پر

دھڑ دھڑ پڑتے

آگ کے درّے

ایک عجب کہرام بپا ہے''

''آدھی صدی کے بعد'' میں مظاہر فطرت کی رنگینیاں اور شادابیاں نمایاں ہیں، صرف چند مثالیں:۔

''دن کا پچھلا پہر

اور اوڈیسس

اوڈیسس کے جرار ساتھی

چری، باجرے، دھان اور نیشکر

کے پراسرار کھیتوں کا کالا سمندر''

''مگر چاروں جانب

مہکتے ہوئے گرم تنور

نہر کی کوکھ......

کھیت کی مینڈھ

شب کی کالی قبا

ہر طرف

ہر جگہ

الجھے بالوں، چمکتی ہوئی

تیز آنکھوں میں

بچپن

خنک چاندنی کی طرح

آج بھی موجزن ہے

زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے''

''پرندے کی منقار پر بیٹھ کر

چہچہاتا ہے

دیپک کی لو پر

ہمکتا ہے

تارے کے بھیگے پروں پر

زباں کی لرزتی ہوئی نوک پر

اس کی روشن صدا

گونجتی ہے''

''آدھی شام

پھولوں کا گجرا بنی

روبرو آ کے رکتی

ادھر میں بڑے باغ کے

سرد پھولوں کی جانب لپکتا''

''مگر پھر

کوئی اڑتی سرگوشی، تتلی

نجانے کدھر سے مری سمت آتی''

''میں سورج تھا

اور سبز ریشم میں ملبوس

ماتھے پہ جھومر سجائے

یہ دھرتی مرے گرد پھرتی تھی''

''اک کتھا انوکھی''میں آئرن ایج کا المیہ فطرت کے حسن کی تباہی کا نوحہ بن جاتا ہے:۔

''سورج میں کالک آگ آئی

چاند کا ہالہ ٹوٹ گیا

دیکھ کہ گھاس جلی جھلسی ہے

ندیوں میں جل سوکھ گیا''

''گلشن بے آباد ہیں سارے

ریت کے دھارے

ریت کے دھارے تیل کے دھارے بن کر

ابل پڑے ہیں

لوہا جیسے جاگ اٹھا ہے

چہک رہا ہے

چاروں جانب کوک رہا ہے

تتلی، بھنورا، کوئل، چڑیا

سب لوہا ہے

لوہے کے پَر اُگ آئے ہیں''

''آدھی صدی کے بعد''میں دھرتی کی زرخیزی یوں ابھری ہے:

''عجب روشنی تھی!

مہکتے ہوئے سبز باغات

پنچھی

کسانوں کے گھر

کھیتیاں

میرے دامن پہ

گوٹے کناری کی صورت دمکتی تھیں

میں ساری دھرتی کو

سینگوں پہ اپنے اٹھائے

کھڑا تھا

مرے دَم سے

گندم کے خوشبو میں دانے تھے

اشجار بارِ ثمر سے جھکے تھے''

مگر ''اک کتھا انوکھی'' میں لوہے کے راج نے دھرتی کو بانجھ کر دیا ہے:

''یہ کلجگ ہے

کلجگ۔ جو سرطان کی صورت

پھیل چکا ہے

دھواں اگلتے، آہیں بھرتے

بوڑھی، بانجھ ملوں کے پنجر

کھمبوں کی صورت

دھرتی کے اندر سے جیسے اُگ آئے ہیں''

''دھرتی جننا بھول گئی تھی

لوہا سر پر اک فولادی تارج رکھے

اس دھرتی کا سرتاج ہوا تھا

وہ دن اور پھر آج کا دن

اس دھرتی پر نہ رات آئی

نہ دن نکلا

نہ شام ہوئی ہے

ایک مسلسل آندھی

بے آرام ہوئی ہے''

پانی کی روانی ارتقاء کی کہانی ہے۔ پانی رک جائے تو جوہڑ بن جاتا ہے۔ محبت اور انسانیت بھی پانی کی طرح ہوتے ہیں۔ ''آدھی صدی کے بعد'' میں وزیر آغا نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے:

''وہ دریا نہیں تھے

فقط چھوٹے چھوٹے سے جوہڑ تھے

ٹھہرے ہوئے باسی پانی کے

اندھے گڑھے تھے

سنگھاڑوں، جڑی بوٹیوں

سوکھے، گنجان جھاڑوں سے

لپٹے پڑے تھے

اسے یوں لگا

جیسے پانی رواں ہو تو پانی ہے

ورنہ غلاظت سے لبریز

اندھا گڑھا ہے

فقط ایک اندھا گڑھا!''

''اک کتھا انوکھی'' میں ''آدھی صدی کے بعد'' کا یہ اشارہ کھل کر بیان ہوا ہے یہ ایک سطح پر ہمارا قومی المیہ ہے تو دوسری سطح پر پوری دنیا کے انسانوں کا المیہ ہے۔ آج کا انسان اپنے تعصب کی نجاستوں میں گھرا پوری انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لے آیا ہے:

''تو کہتا ہے

چپ کی تہہ در تہہ سلوٹ میں

انسانوں پر کیا بیتی ہے

کس نے ان کی رکھشا کی ہے؟

میں کہتا ہوں

ان کو رکھشا کی حاجت ہی کیا ہے

یہ سب

نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں!
ساگر جس نے
ان کیڑوں کو جنم دیا تھا
اب اک گندا جوہڑ بن کر
ان کے اندر کے جوہڑ سے
آن ملا ہے
ساگر کا ایمان ہوا ہے
ساگر ماں ہے
ماں ہتھیا
اس کلجگ کا ایمان ہوا ہے''

نسلی پاگل پن قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر ہمارے سامنے ہے۔ یہاں ''ساگر'' کے معنوں میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ مذہبی طور پر بھی یہی تصور ہے کہ انسان کو پانی سے پیدا کیا گیا۔ سائنسی طور پر بھی یہی کہا جاتا ہے کہ زندگی کی پیدائش سمندر سے یا پانی سے ہوئی......اب وہی سمندر ایک طرف صنعتی دور کی آلودگیوں کا شکار ہے دوسری طرف بڑی طاقتوں نے اپنی بحری قوتوں کو حد سے زیادہ بڑھا لیا ہے۔ گویا دوسروں پر غالب آنے اور ان پر قابض ہونے کی ہوس جو اندر کے جوہڑ میں بدل چکی ہے اس نے کھلے سمندر کو بھی جوہڑ میں تبدیل کر دیا ہے۔

جنگل ثقافت کی علامت۔ ''آدھی صدی کے بعد'' میں ہماری ثقافتی خوبصورتی یوں ابھرتی ہے:

''معاً میں نے دیکھا زمیں پر ہوا تھی
ہوا کے تڑختے ہوئے فاصلے تھے
مگر سبز دھرتی کی
ٹھنڈی تہوں میں
جڑوں کی پُراسرار وحدت تھی

سب فاصلے
ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے
ہزاروں جڑیں
ایک ہی جڑ سے پھوٹی تھیں،
آگے بڑھی تھیں
مگر جڑ سے ایسی جڑی تھیں
کہ چلنے کے عالم میں
ٹھہری ہوئی تھیں
یہ ساری جڑیں
سبز دھرتی کی اپنی جڑیں تھیں
جو خود اس کے گیلے بدن میں
اترتی گئی تھیں۔''

''اک کتھا انوکھی'' میں جنگل کے وسیلے سے عالمی ثقافتی بحران بلکہ ثقافتی تباہی کا دکھ یوں بیان ہوا ہے:

''اور اب...... یہ سب
گندے کیڑے
جنگل پر بھی جھپٹ پڑے ہیں
جنگل جس نے کتنا ان سے
پیار کیا تھا
ان کی کتنی نسلوں کو پالا پوسا
آباد کیا تھا

اب یہ اس جنگل کو
اپنے ساتھ ستی ہو جانے پر
مجبور کریں تو بول
یہ کیسا انیائے ہے!
جنگل جنگل آگ لگی ہے''

''دھڑ دھڑ جلتے جنگل میں ہم
ننگے پیروں چلتے
اپنے آپ کا اک مدھم سا عکس
ہوا کا لمس بنے ہیں
ہم اب راکھ ہیں اور
ہم سب نے
اپنی راکھ کو
اپنے ہی تاریک مکھوں پر
تھوپ لیا ہے،
آنسو کی بے نام نمی سے
اپنی پیاسی ''پیاس'' کو بے زنجیر کیا ہے''

جنگ کی علامت کے ذریعے ثقافتی تباہی کے ذکر کے بعد اس کے سبب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

''سونے والے!
تو گم صم، بے ہوش پڑا تھا
اور ہم روگی جاگ رہے تھے

یک دم
ایک پہاڑ پھٹا تھا
اور بلائیں
چیخوں کی صورت نکلی تھیں
کومل، میٹھی آوازوں پر جھپٹ پڑی تھیں،
بم، راکٹ، جٹ، جمبو، باجے بھڑک اٹھے تھے''

''آدھی صدی کے بعد'' میں زندگی کی دھڑکن ایک مدھر گیت کی صورت ابھرتی چلی جاتی ہے:

''ٹیٹری کے رنگین انڈوں
حسیں چھتریوں والی کھمبوں
چھنکتے ہوئے
ہریلوں، نیل کھنٹوں، بھجنگوں
کے اجلے پروں کے لئے
اک انوکھی تڑپ
ننھے سینوں
کے جھرنوں کے اندر
چھلکتی ہوئی بے قراری
سمندر کے اندر سمندر!''

''نگاہوں میں نشہ
لبوں پر دہکتی ہوئی ایک لرزش
ہر اک شے کو چھونے کی
اور چوم لینے کی بے نام خواہش

لہو بن کے
نیلی رگوں میں رواں تھی''

''چاروں طرف
ریشمیں ڈوریاں ندیاں
مجھ کو تھامے کھڑی تھیں
مرے سامنے ایک بانکا، سجل تیز دریا تھا
دریا
جو ریشم کا دھاگا تھا
سوزن تھا
اپنے ہی دونوں کناروں کو پیہم رفو کر رہا تھا
زمیں کے ادھڑتے ہوئے چاک کو
سی رہا تھا''

''وہ چھِن بھر میں
کتنا بڑا ہو گیا تھا!
جواں ندیاں
سست دریا
سبھی دست و بازو تھے اس کے
مہک اس کی
کھیتوں، گھنے جنگلوں
سبز چوغوں میں ملبوس ٹیلوں

دھڑکتے مکانوں
چمکتے ہوئے تازہ جسموں میں
پھیلی ہوئی تھی''

لیکن ''اک کتھا انوکھی'' میں دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی ہے۔ انسان انسان نہیں رہا مشین یا روبوٹ بن گیا ہے:

''سونے والے!
جب دھرتی پر
آوازوں کا شور اٹھا تھا
اور فولاد کا راج ہوا تھا
انساں سارے
لوہے کے روبوٹ بنے تھے
بے چہرہ، بے نام ہوئے تھے
کالے، پیلے ہندسے بن کر
لفظوں کے انکھوؤں پر جیسے ٹوٹ پڑے تھے
اک اک ''لفظ'' پہ ثبت ہوئے تھے
اور اب
ہندسے ہی ہندسے ہیں
جمع کرو تو دگنے تگنے ہو جاتے ہیں
لاکھوں کا اک لشکر بن کر
آگ اور خون کے کھیل کا منظر
دکھلاتے ہیں
ضرب لگے تو

بھنور سا بن کر تیز ہوا کا
پاگل بھوتوں کے
وحشی گرداب کی صورت
ایک ہی پل میں دھرتی اور آکاش سے اونچے اٹھ جاتے ہیں
گرواگر تفریق، صفر ہو جاتے ہیں''

سوال یہ ہے کہ کیا وزیر آغا جدید سائنس، اس کی ترقی اور فیوض و برکات سے انکار کر رہے ہیں؟ صنعتی ترقی، راکٹ، جمبو جٹ۔۔کیا وزیر آغا نے ان حقائق کو جھٹلایا ہے؟

وزیر آغا کو پوری طرح پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ مذہب، نفسیات، اساطیر اور تاریخ تہذیب کو بھی جدید ترین انکشافات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور علم الحیات، علم الانسان، طبیعات فلکیات غرضیکہ تمام علمی دھاروں سے بڑی حد تک آگاہ رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف جدید علوم اور جدید ترین انکشافات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ ادب کو ان سے ہم آہنگ بھی کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جدید سائنس کی برکات سے انکار نہیں کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جس کسی بہت زیادہ مفید شے کا منفی استعمال بہت زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے اسی طرح صنعتی ترقی کے منفی استعمال نے انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، صنعتی ترقی نے شہروں کو پھیلا دیا ہے، دیہاتوں اور جنگلوں کو ختم کیا ہے۔ حرص و ہوس نے مادیت پسندی کو فروغ دیا ہے۔ جس میں روحانی اور اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ نفسانفسی کے اس ماحول نے نفرتوں اور عصبیتوں کو جنم دیا ہے۔ ایٹم، نیپام، نیوٹران۔۔ظاہر ہے ہوس پرستوں نے یہ تباہ کن بم ڈیکوریشن پیس کے طور پر تیار نہیں کرائے۔ انسان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اس کے سینے میں اب دل نہیں دھڑکتا بلکہ وہ اب روبوٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی پہچان کے مقامی ثقافتی دائرے سے لے کر عالمی ثقافتی دائرے تک سب نشان مٹتے جا رہے ہیں۔ حرص و ہوس اور نفرت کے پاگل پن کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔

اس ساری صورت حال نے انسان کے اندر کی روحانی اور تخلیقی روشنی کو بجھا دیا ہے۔ لفظ غیر

اہم ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ ہندسوں نے لے لی ہے۔ دراصل وزیر آغا نے کرّہ ارض کے تخلیقی لحاظ سے بانجھ ہو جانے پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن بے یقینی اور خوفناک حالات کے باوجود مایوس بھی نہیں ہیں۔ منفی صورتحال کو پیش کرنے کے بعد وہ دعائیہ انداز اختیار کرتے ہیں اور ان کے اس دعائیہ انداز میں قبولیت دعا کا یقین شامل ہے:

''سونے والے
باہر آ
اور امرت رس سے بھرا ہوا
مہتاب کا کاسہ
سورج کے ہاتھوں سے لے کر پی
کہ تیری آنکھ سے پھر
کرنوں کا سونا
چشمہ بن کر پھوٹ بہے
اس میرے جگ کو
نئے جنم کی ملے بشارت
میرے مورکھ دل کو بھی آنند ملے
میری آنکھ بھی
کشتی کا بہروپ بھرے
پال اڑا کر
نورانی موجوں پر سفر کرے
بجھے ہوئے اس میرے قلم کی
نوک پہ بھی اک
پربت جتنے

شبنم ایسے
لفظ کا دیپ جلے
اِک ''لفظ'' کا دیپ جلے!''

''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' کے موضوعاتی مطالعہ سے ہٹ کر ان نظموں کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ یہ اپنے ثقافتی پس منظر سے ابھرتی ہیں اور عالمی ثقافتی دائرے تک جاتی ہیں۔ ''آدھی صدی کے بعد'' میں برصغیر کی بعض قدیم روایات کے حوالے بھی آئے ہیں۔ مثلاً سوئمبر، لچھمن ریکھا اور یم راج۔ اور برصغیر سے باہر کے بعض حوالے بھی آئے ہیں: مثلا اوڈیسس، قاف اور شانگری لا۔ ''اک کتھا انوکھی'' میں اس سلسلہ میں خاصی وسعت آئی ہے ایک طرف تو اس میں ماں پترو اور کنڈ کانگڑی کے دو اہم حوالے آئے ہیں جو کشمیری علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری طرف آئسس، شمس، زیوس اور شیو کے ناموں سے مصری، سمیری، یونانی اور ہندی تہذیبوں کے قدیم ترین حوالے ابھرتے ہیں۔ ''اک کتھا انوکھی'' کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک بھی اضافت استعمال نہیں کی گئی اور فارسی کے اثرات کی بجائے مقامی اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔

وزیر آغا کی تمام نظموں میں بالعموم اور ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' دونوں نظموں میں بالخصوص جو امیجری آئی ہے اس میں اتنی تازگی، شگفتگی، اور یجنلٹی اور RICHNESS ہے جو جدید نظم میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ دونوں نظموں سے اس کی چند مثالیں پیش ہیں جو میرے اس دعوے کی دلیل ہیں۔

پہلے ''آدھی صدی کے بعد'' سے مثالیں:

''معا'' بیل گاڑی سے میں کود کر
بانہیں کھولے ہوئے اپنے گھر میں
لپک کر گھسوں
ماں کے سینے سے ٹکراؤں

ہونٹوں کے حیرت سے کھلنے کا
اور پو کے پھٹنے کا منظر
میں دیکھوں''

''نہر میں کودتے
ننھے، منے برہنہ بدن
''گاچنی'' ایسے پانی میں
گرتی ہوئی تختیاں
مردہ لفظوں کے بہتے ہوئے
پھول
اور پتیاں
دھوپ کی قاش ایسے
سنہری بدن
زرد پانی میں جیسے ہمکتا چمن!''

''گلیوں کے غاروں
مکانوں کی درزوں
کلس اور مینار کی رفعتوں سے
مجھے جیسے آواز دیتا تھا کوئی
یہ کہتا تھا:
تو
شہر کا دل ہے،

دل میں
لہو کی تڑپتی ہوئی بوند ہے
تجھ پہ سارے جہاں کی نگاہیں جمی ہیں۔
تو پلکیں اٹھا
دیکھ
سارا زمانہ تجھے دیکھتا ہے'

''مجھ کو محسوس ہوتا کہ سارا فلک
ایک ٹوٹا ہوا آئنہ ہے
ستارے
چمکتی ہوئی کرچیاں ہیں
میں خود ہر ستارے کی کرچی میں ہوں
جیسے کمسن زمیں
اور بوڑھا فلک
اور معصوم تارے
سبھی میرے ہم راز
سب میرے اپنے ہیں
میں سبز مخمل کی مسند پہ بیٹھا ہوں
تینوں زمانے
مرے سامنے
دست بستہ کھڑے ہیں'

''کہاں پھر رہے ہو؟
یہاں لفظ کا کوئی معنی نہیں ہے
یہاں تو فقط گیلی مٹی ہے
مٹی کی شکلیں ہیں
بارش کا پہلا ہی چھینٹا پڑا
تو پگھل جائیں گی
اور کیچڑ سے بازار
بھر جائیں گے
تم بھی مٹی کے پتلے ہو
برکھا کے آنے تلک
اپنی صورت کو باقی رکھو
تم بھرم اپنے ہونے کا باقی رکھو!'

''خوشی
سرہنہ، اکیلی، جواں
اک کنارے پہ روتی تھی
اور بین کرتی تھی
دکھ اپنا لشکر لئے
دوسرے گھاٹ پر
خیمہ زن، شادماں
اور میں
دکھ کی ننگی خوشی

اور خوشی کی سلگتی ہوئی پیڑ

کے درمیاں

اک نشاں

جیسے چھمن کی ریکھا

جسے پاؤں کی نوک چھُو لے

تو تاریخ کا رُخ بدلنے لگے''

''دریا مگر مطمئن تھا......

گھسے تیز پہیوں، پَروں

سیٹیوں کے

لگاتار حملوں سے

محفوظ

پانی کے بے نام دھاروں میں

ڈھلتا

سمندر کی تہہ میں

اترنے لگا تھا

کسی طفلکِ گمشدہ کی طرح

ہاتھ پھیلائے

روتی ہوئی مادرِ مہرباں کی طرف

جا رہا تھا

پہاڑوں کے دامن سے

ادھڑے ہوئے ساحلوں تک

وہ ہر دم سفر میں تھا

ہر دم

رُکا بھی ہوا تھا

سمندر کی جانب رواں تھا

مگر خود

سمندر کا پھیلا ہوا ایک بازو بھی تھا

سب نے دیکھا

پہاڑوں کے شانوں پہ

اک ہاتھ رکھے

وہ اپنی ہی سوچوں میں

گم

اک فروزاں سے لمحے میں

ڈوبا ہوا

کس قدر شانت

کتنا بڑا ہو گیا تھا!''

''وہ بڑ

کب کا صحرا کے سینے میں گم ہو چکا ہے

مگر آج میں جانتا ہوں

وہ میری ہی تصویر تھا میرا اوتار تھا

میرا چہرہ تھا وہ

میں نے خود اس کو بھیجا تھا

اپنی طرف
اسے خود بلایا تھا اپنی طرف!''

''کہو کون تھا وہ؟
کہ جس نے کہا تھا
ستارے فقط پات ہیں
کہکشائیں
گندھی نرم شاخیں ہیں
آکاش، اک سبز چھتنار
ہر شے پہ سایہ کناں ہے
مگر اس کی جڑ
اس کے اپنے بدن میں
نہیں ہے''

''آدھی صدی کے بعد'' کی امیجری کے بعد اب ''اک کتھا انوکھی'' کی امیجری دیکھیں:
''رشتے
بانکی موجوں ایسے
لپک جھپک کر آئیں
پل بھر رک کر
گرہ بنائیں
پھر ساحل کی سل پر
گر کر

کرچ کرچ ہو جائیں''

''اس نے جسے کروٹ لی ہے
اور پوچھا ہے
کہاں ہوں میں؟
کیا سمے ہوا ہے؟
اس بے انت گھنیری بوجھل نیند سے پہلے
رانجھن، سوہنی، مرزا، رادھا، پنوں۔۔۔سارے
شبنم کے نمناک ستارے
ان میں سے بھی کوئی بچا ہے؟

''کون بچا ہے''؟
آنسو پی کر
رندھی ہوئی آواز میں اس سے
میں کہتا ہوں!
آنکھیں کھول کے باہر آ
اور دیکھ کہ گلیاں سب
اجڑی ہیں''

''وہ کہتا ہے
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی
میں جب سویا

ہر شے جاگ رہی تھی
پھولوں میں رس
ندیوں میں چاندی بہتی تھی
دریاؤں کے پاٹ کشادہ
پیڑوں پر پھل، پھول لگے تھے
گائے گابھن، گری لباب
نار کی گود ہری تھی
راجہ خوش تھا
پرجا خوش تھی
دھرتی جیسے کنول کی صورت کھلی ہوئی تھی'

''اور ہم
جواَب پُرش نہیں ہیں
اپنی اپنی قبروں پر ہم
نصب ہوئے ہیں
ہم جو اُڑتی کالک اور
آواز کے چاک سے اترے ہوئے
کوزوں کے نقش ہیں
اپنے آپ کی پرچھائیاں ہیں'

''جب سے ہم
اندر سے کٹ کر

باہر میں آباد ہوئے ہیں
بھاری بوجھل آوازوں کے
قدموں میں پامال ہوئے ہیں
اور ہماری آنکھیں جب سے
اگنی وش
کی برکھا سے دوچار ہوئی ہیں
آتش بازی کے منظر کا حصہ بن کر
خود بھی آتش بار ہوئی ہیں
اندر والے دیپ کی
بھیگی خوشبو سے ناراض ہوئی ہیں'

''نیند کے ماتے!
دیکھ!......وہ سندر دھوپ
وہ اونی شال
جسے ہم اوڑھ کے روز پھرا کرتے تھے
دھوپ کہ جس کے لمس میں
ماں کے نرم گداز لبوں کی شیرینی تھی
جس کے سانس میں مرغابی کے پر کی گرمی
کچی نرم سگندھ کلی کی
رچی بسی تھی'

''آدھی صدی کے بعد'' زندگی اور اسکے حقائق سے بے خبر نہیں ہے۔لیکن ماضی کی خوبصورت یادوں کے باعث اس پر ایک خواب ناک فضا چھائی ہوئی ہے، جس سے نظم کے حسن میں اضافہ ہوا

ہے۔لیکن نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں اس دھرتی پر جو تیز تر تبدیلیاں آئی ہیں اور جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، ان تلخ حقائق نے وزیر آغا کو خوابناک فضا سے نکال کر جگ بیتی رقم کرنے پر آمادہ کیا ہے۔’’اک کتھا انوکھی‘‘ انہیں تلخ حقائق کا شیریں ثمر ہے۔اس نظم کے دو کردار سویا ہوا انسان اور اسے جگانے والا دونوں ایک ہی وجود ہیں اور ظاہر و باطن کی علامت ہیں۔ہمارے بیشتر دکھوں کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے اندر کے شخص کو مار ڈالا ہے یا سلا رکھا ہے۔وزیر آغا نے اس نظم کے اسلوب سے دراصل ہمیں اپنے اندر کو بیدار کرنے کی تحریک دی ہے، کیونکہ اس کی بیداری ہی میں ہمارے مسائل کا حل ہے:

’’سونے والے!
تو جب خود کو اوڑھ کے سویا
کانوں کے پٹ
اندر کی جانب کُھلتے تھے
کومل، میٹھی آوازیں تب
اندر سے دستک دیتی تھیں
اندر جو پریوں کا مسکن
آئسس، شمس، زیوس، شیو۔سب کی
آوازوں کا ایک نگر تھا
خود ’’باہر‘‘ بھی
جس ’’اندر‘‘ کا
اک حصہ تھا!‘‘

وزیر آغا کے نزدیک ہمارا ’’اندر‘‘ سے کٹ کر ’’باہر‘‘ میں آباد ہونا ہی ہمارے عذابوں کا سبب بنا ہے۔’’اندر‘‘ لفظ تخلیق کرتا ہے ’’باہر‘‘ اسے ہندسوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔اسی سے تخلیقی لحاظ سے بانجھ پن پھیلا ہے۔’’سونے والا‘‘ بیج کی چھال میں لپٹا ہوا ہے۔بیج تخلیقیت کی علامت ہے اور

سونے والے کو بیدار کرنا بانجھ پن کو ختم کرنے کا عزم ہے۔یوں یہ نظم اس دھرتی کے مسائل کے ساتھ ادب کے ایک اہم اور بنیادی مسئلے پر بھی بحث کرتی ہے اور اس کا حل سامنے لاتی ہے۔

’’آدھی صدی کے بعد‘‘ اور ’’اک کتھا انوکھی‘‘ دونوں نظمیں وزیر آغا کے اندر کا سفرنامہ ہیں۔ پہلی نظم ماضی سے حال تک آتی ہے اور اس میں آپ بیتی غالب ہے جبکہ دوسری نظم حال میں رہتے ہوئے ماضی کو چھو کر مستقبل تک لے جاتی ہے اور جگ بیتی بن جاتی ہے۔دونوں نظمیں وزیر آغا کی بہترین نظمیں ہی نہیں جدید ادب کی اعلیٰ ترین اور خوبصورت ترین نظمیں ہیں۔’’آدھی صدی کے بعد‘‘ نے نو سال کے عرصہ میں جدید نظم نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔’’اک کتھا انوکھی‘‘ بھی جدید نظم نگاروں کی ایک نسل کو متاثر کرے گی اور نظم نگاری میں مزید تبدیلیاں پیدا کرے گی۔

بلاشبہ وزیر آغا جدید اردو نظم کے مجتہد اور جدید تر اردو نظم کے پیش رو ہیں۔

چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل

وزیر آغا کی ''کلیات'' 1946ء سے 1990ء تک ان کے شعری سفر کے روداد ہے۔ سات شعری مجموعوں پر مشتمل 760 صفحات کی اس کلیات کا نام وزیر آغا نے ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل''، رکھا ہے'' کلیات'' کے ص4 پر یہ دو اشعار درج ہیں:

چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل
ڈار جھکی جب قازوں کی
عکس اُگے پانی کے اندر
دُھول اڑی آوازوں کی

یہ اشعار ''کلیات'' کے نام کی وجہ تسمیہ کافی حد تک بیان کر دیتے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک اس نام سے وزیر آغا کا ادب کے ساتھ عشق ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ثبوت میں، میں ان کی ایک پُرانی نظم ''عشق'' کا حوالہ دیتا ہوں:

اک پتھریلی چُپ نے سینہ تان لیا
دل نے دستک دے کے کہا: پہچان لیا؟
یہی ہے تیری منزل، تو نے جان لیا؟
منزل بھی یہ کیا منزل ہے، سانس نہ لو
بات کرو پر بات کے ساتھ آواز نہ ہو
موتیوں ایسے نیر گریں، جھنکار نہ ہو

ہنستی چال! چہکتی چھاگل! ہوش کرو
دل پاگل ہے، پاگل کی مت بات سنو
اس گہرے سنّاٹے میں خاموش رہو

عشق کا یہ سارا منظر نامہ، یہ ساری کیفیات وزیر آغا کی پوری شاعری میں صورت بدل بدل کر نظر آتی ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری میں یہ ''عشق'' کمزور طبقوں سے ہوا۔ ''دھرتی کی آواز'' ''ننھے مزدور'' اور ''شبِ یلدا'' اسکی بہترین مثالیں ہیں۔ کمزور اور مظلوم طبقے کی حمایت میں وزیر آغا نے کہیں بھی سیاسی لیڈر بننے کی کوشش نہیں کی اور اپنی شاعری کو شاعری کی ارفع سطح پر رکھا۔ آگے چل کر وزیر آغا کا ''عشق'' پورے انسان کے لیے ہو گیا۔ وہ انسانیت کی بقا کے لیئے فکر مند ہوئے۔ ایٹم کی ہلاکت خیزیوں کا ہمارے ادیبوں نے بہت کم ادراک کیا ہے۔ وزیر آغا ایٹمی ہتھیاروں کو پوری انسانیت کے لیئے سنگین خطرہ سمجھتے ہیں۔ چرنوبل کا سانحہ ہوا تو انہوں نے اپنی نظم ''چرنوبل'' میں برملا کہا:

زمیں کی کوکھ میں ہیجان ہے
آکاش۔۔اک تانبے کا خیمہ ہے
ہَوا نے بھر لیا ہے اپنا نافہ
اس کے جلتے جسم کی بُو سے
ہوا اب چوکڑی بھرنے کو ہے
اڑنے کو ہے۔۔پاگل ہوا
اب سبز کھیتوں، ناچتے شہروں میں جائے گی
پھلوں پھولوں، چہکتی کونپلوں کو چُھو کے گزرے گی''

نظم ''پوسٹ مارٹم'' میں تو انہوں نے ایٹمی جنگ کے بعد کا منظر پیش کر کے دنیا کے ارباب اختیار کو ایک طرح سے خوف آور احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔

وزیر آغا کا عشق پوری انسانیت سے ہے اسی لئے وہ ایک طرف تو انسان کے اثبات کا اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف خوف کے عالم میں بھی معجزوں کی امید رکھتے ہیں۔ انسان کے اثبات کی مثالیں:

''کروڑوں ستارے
شعاعوں کی بے سمت ''بے لفظ'' گونگی زباں میں
لرزتے لبوں سے
''نہ ہونے'' کے منکر تھے
ہونے کا اعلان کرتے چلے جا رہے تھے!

فقط اپنے ہونے کا اعلان میں نے کیا
اور بے تاب پھولوں سے، ساون کے جھولوں سے
چڑیوں کی لوری سے
ہر زندہ ہستی کے سانسوں کی ڈوری سے
آواز آئی:
مجھے اپنے ''ہونے'' کا حق الیقیں ہے
میں اعلان کرتی ہوں اپنا!''

(نشر گاہ)

''مجھ کو محسوس ہوتا کہ سارا فلک
ایک ٹوٹا ہوا آئینہ ہے
ستارے
چمکتی ہوئی کرچیاں ہیں
میں خود

ہر ستارے کی کرچی میں ہوں
جیسے کمسن زمیں
اور بوڑھا فلک
اور معصوم تارے
سبھی میرے ہم راز
سب میرے اپنے ہیں
میں
سبز مخمل کی مسند پہ
بیٹھا ہوں
تینوں زمانے
مرے سامنے
دست بستہ کھڑے ہیں''

(آدھی صدی کے بعد)

اپنی ذات سے کائنات تک کا اثبات دراصل انسان کا بلکہ پوری زندگی کا اثبات ہے۔ زندگی جسے شدید خطرات لاحق ہیں لیکن وزیر آغا نے امید کا دامن تھام رکھا ہے:

''سنا یہی ہے
پہلے بھی اک بار دُکھی آکاش کی آنکھیں ٹپک پڑی تھیں
پر دھرتی کی آخری ناؤ
زیست کی بکھری قاشوں کو چھاتی سے لگائے
پانی کی سرکش موجوں پر ناچ دکھاتی
دور افق تک جا پہنچی تھی!
آج مگر وہ ناؤ کون سے دیس گئی ہے''

(دکھ میلے آکاش کا)

''معاً کھردری، خشک دھرتی کے چہرے پہ بننے لگا
آنے والے زمانوں کا اک نقش پیارا
وہ اک خواب جس کو چمکتے ستاروں،
دہکتے ہوئے تیز رنگوں کا فرغل دلانے کی کوشش میں
ہم تم نے عمریں بتائیں
زمانہ گذارا''

(اک نقش پیارا)

عشق ومحبت کا سلسلہ دائرہ در دائرہ ہوتا ہے۔ یہ ذات سے کائنات تک کا سفر ہے اور وہ ذات سے کائنات کے درمیان بھی کئی رشتے آتے ہیں وہ رشتے بھی اسی عشق کی لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماں، باپ، بیٹی، بیٹا، بھائی، بہن، بیوی۔۔ یہ سارے رشتے وزیر آغا کی نظموں میں اپنی اپنی محبت کا جادو جگاتے ہیں۔

ماں سے وزیر آغا کی محبت کئی نظموں میں ظاہر ہوتی ہے'' نظم ''ماں'' (پہلا روپ) ''ماں'' (دوسرا روپ)،'' ذات کے روگ میں''، ''حادثہ''، ''جزیرے''، '' اندھی کالی رات کا دھبہ''، ''ایک خواب''۔ ان نظموں میں وزیر آغا کی ماں سے محبت کئی خوبصورت رنگوں میں ابھرتی ہے۔'' آدھی صدی کے بعد'' میں تین جگہوں پر ماں کی محبت بڑی شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ چند نظموں کے اقتباسات سے اس محبت کی شدت اور اس کے اظہار کا اندازہ کیجئے:

''میں آنکھوں کے پانی کو روکوں مگر پانی کیسے رُکے
تب میں چیخوں، بلاؤں اسے
گہرے نیلے سمندر کی تہہ میں وہ ہوگی کہیں، کون جانے!
مگر وہ بلاوے کو سن کر، سمندر کی تہہ سے ابھر کر
مرے پاس آئے، مجھے چھو کے دیکھے

کہے تم کہاں تھے؟
خدارا بتاؤ کہ تم اتنا عرصہ کہاں تھے؟
مجھے خود سے لپٹائے، مہکی ہوئی گود میں لے کے جھولا جُھلائے
کوئی گیت گائے جو سیّال چاندنی کا چشمہ سا بن کر بہے
دُھند بن کر اُڑے
مجھ کو سورج کی چبھتی تمازت سے محفوظ کر دے
کہے اب تو جانے نہ دوں گی تمہیں
اب میں جانے نہ دوں گی تمہیں!''

(ذات کے روگ میں)

''کون بتائے ان بچوں کو
ماں ندّیا کے اندر کب ہے
ماں تو خود اک تیز ندی ہے
ماں اک دُودھ بھری ندّی ہے!''

(حادثہ)

''دھندلکوں کے باریک دھاگوں میں لپٹی ہوئی
مطمئن، بے خبر
میں نے دیکھا۔۔ وہ مجھ پر جھکی تھی
وہ چشمِ حسیں جس کے ہر انگ میں مامتا تھی
مجھے یوں لگا تھا وہ چشمِ حسیں تو مجھے
بس مجھے گھورتی ہے
کسی اور کو دیکھنے کی اسے نہ تو فرصت
نہ ہمت، نہ خواہش

فقط مرکزِ ہست کو دیکھتی ہے
مجھے دیکھتی ہے''

(ایک خواب)

''بولو، اپنے ہونٹوں پر کوئی شبد سجاؤ
منتر جاپو، ہاتھ اٹھا کر پڑھو دعائیں
چہرے دھو کر، سیدھے ہاتھ کی انگلی کے یاقوت میں جھانکو
بولو تم نے کیا دیکھا ہے؟

صدیوں تم نے اس کو چاہا
اس کی سیمیں انگلی تھامی، چلنا سیکھا
اس کے ٹھنڈے نورانی چھتنار کے نیچے
گھاس پہ لیٹے''

(اندھی کالی رات کا دھبہ)

''دمکتے ابر پارے
اس کے ہونٹوں سے ٹپکتے نرم بوسے ہیں
ہواؤں کے جواں قاصد جنہیں لے کر بکھرتے ہیں
پہاڑوں، جنگلوں، بے آب صحراؤں میں پھرتے ہیں
انہیں آواز دیتے ہیں جو ماں کی گود سے نکلے
مگر اب تک نہیں لوٹے
''یہ بوسے ماں نے بھیجے ہیں
یہ بوسے ماں نے بھیجے ہیں''
مگر آواز پر لبیک کوئی بھی نہیں کہتا

ہمیں تو ماں کے خدّ و خال تک بھی یاد کیا ہوں گے
ہمیں تو ماں کے ہونے کی خبر تک بھی نہیں شاید
کہ ہم ہجرت کے دن سے آج تک
اپنے ہی جسموں کی گھنی خوشبو میں لپٹے
خوف کی وادی میں بیٹھے ہیں''

(جزیرے)

اس دھرتی کا غالب حصّہ پانی ہے۔ تین حصّے پانی میں خشکی کے جزیرے دراصل ماں کی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد ہیں، دھرتی ماں کی نسبت سے وزیر آغا کے ہاں ندی سے سمندر تک ماں کا روپ اختیار کر جاتے ہیں۔ ''اندھی کالی رات کا دھبّہ'' میں بھی ماں کی ہستی موجود ہے شاید اس لئے بھی کہ چاند اسی دھرتی کا بچھڑا ہوا حصہ ہے۔

باپ سے وزیر آغا کی محبت دو صورتوں میں سانے آئی ہے۔ ایک تو والد کی وفات کے معاً بعد صدمے کی کیفیت اور دوسری والد کی یادوں کی باز آفرینی اور ان میں اپنا عکس دیکھنے کی صورت ہے۔ دونوں مثالیں دیکھئے:

''چلی کب ہوا، کب مٹا نقشِ پا
کب گری ریت کی وہ ردا
جس میں چھپتے ہوئے تو نے مجھ سے کہا:
آگے بڑھ، آگے بڑھتا ہی جا
مڑ کے تکنے کا اب فائدہ؟
کوئی چہرہ، کوئی چاپ، ماضی کی کوئی صدا۔ کچھ نہیں اب
اے گلّے کے تنہا محافظ! ترا اب محافظ خدا!''

(سفر کا دوسرا مرحلہ)

''سو جب رات ڈھلتی

ہوا تیز چلتی
تو ہم اپنے بابا سے کہتے:
ہمیں بھی کبھی چھنی کچھی سٹیشن دکھاؤ
سنا ہے وہاں اک پہاڑی نے
پٹڑی پہ دُھونی رمائی ہے
چوتھی، پراسراری کھونٹ کے در پہ
ڈائن بنی، بال کھولے کھڑی ہے
ہمیں ساتھ لے جاؤ، ڈائن دکھاؤ
ہمیں چھنی کچھی دکھاؤ!
ہمیں۔۔ہم سے وعدہ کرو
بابا۔۔وعدہ کرو!''

اور بابا ہمیں اپنے سینے کے چمٹا کے کہتے:
وہاں جا کے تم کیا کرو گے
وہاں کیا دھرا ہے؟''

''اور ہم
منہ پُھلا کر یہ کہتے
نہیں کچھ نہیں جانتے ہم
ہمیں چھنی کچھی دکھاؤ
ہمیں۔۔ہم سے وعدہ کرو!۔۔''

''اور پھر ایک دن
اپنے بابا کی انگلی سے چمٹے ہوئے
اپنے قصبے سے گاڑی کے ڈبّے میں داخل ہوئے''

''پھر میں دھرتی پہ اترا
دھڑ کتے ہوئے وقت کے آخری بُعد میں آ گرا
چھنی کچھی کی پھیلی ہوئی
منجمد قاش پر
برف کی ایک پتی کی صورت کہیں رُک گیا
میں نے دیکھا
مرے چاروں جانب خلا تھا
مرا بابا جانے کہاں رہ گیا تھا
نہ انجن، نہ گاڑی کے ڈبے
دھواں، آگ، رفتار۔ کچھ بھی نہیں تھا۔''

(ٹرمینس)

''وہ بڑ
کب کا صحرا کے سینے میں گم ہو چکا ہے
مگر آج میں جانتا ہوں
وہ میری ہی تصویر تھا
میرا اوتار تھا
میرا چہرہ تھا وہ
میں نے خود اس کو بھیجا تھا

اپنی طرف

اسے خود بلایا تھا اپنی طرف''

(آدھی صدی کے بعد)

اس مقام تک پہنچتے پہنچتے ''بیٹے'' کا رشتہ ابھرنے لگتا ہے اور پھر وزیر آغا خود باپ کی مسند پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ گویا پہلے ان کی اپنے باپ کے ساتھ جو حیثیت تھی اب ان کے ساتھ وہی حیثیت ان کے بیٹے کی ہو گئی ہے:

''اور پھر یوں ہوا

میں نے اک بار پھر

بڑ کا بہروپ بدلا

خود اپنے ہی اندر سے باہر نکل کر

وہاں، جس جگہ اب سے پہلے

خنک ریت کا ایک صحرا بچھا تھا

میں پتوں کا اک تاج

سر پر سجائے

کھڑا ہو گیا

پھر میں

اپنے ہی چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں

اپنی ہی ریشِ مبارک کے سایے میں

دھرتی کی مسند پہ

تشریف فرما ہوا......

اپنے ''ہونے'' کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں

خود اپنے ہی منظر کو تکنے لگا!''

(آدھی صدی کے بعد)

بیٹی کا رشتہ وزیر آغا کی محبت سے کس طرح گندھا ہوا ہے۔ بیٹی کے اولین معصوم قہقہے پر ہی اس کا اظہار ہو گیا:

''آج میں اک نئی چہکار سے جاگ اٹھا ہوں

قہقہہ۔ ننھی سی گڑیا کا در آیا چپ چپ

اور میں خوابِ گرانبار سے جاگ اٹھا ہوں''

(حیاتِ نو)

ماں، باپ اور بیٹے، بیٹی سے محبت کا روپ ایک طرف ان رشتوں کی صداقت کے مظہر ہیں تو دوسری طرف وزیر آغا کی محبت کا والہانہ اظہار۔۔ محبت کا دوسرا رُخ اس وقت سامنے آیا جب وزیر آغا نفرت کا نشانہ بنے۔ ان کے بعض عزیزوں نے ان کے چھوٹے بھائی کو چکر دے کر پھنسا لیا۔ اس کی برین واشنگ کی گئی اور پھر بھائی، بھائی کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ رشتہ دار اپنی مکّارانہ چالوں پر نازاں تھے۔ وزیر آغا کو دکھ یہ تھا کہ بھائی نے جو رستہ اختیار کیا تھا وہ اس کی اپنی تباہی کا رستہ تھا۔ وزیر آغا اس چھوٹے بھائی کو اس کی اپنی ہی اختیار کردہ اور رشتہ داروں کی تیار کردہ راہ سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس مرحلے میں انہیں جس داخلی کرب سے گزرنا پڑا اس کا اظہار نظم ''بے وفا'' میں ملتا ہے۔ اس میں ''دل'' بھائی ہے اور ''ہوا'' ظالم رشتہ دار۔ نظم دیکھئے:

''دل اک سوکھا پتّا جس نے شاخ سے ناتا توڑا

اپنوں سے منہ موڑ کے جس نے تجھ سے رشتہ جوڑا

سوکھا پتہ شاخ سے ٹوٹا اب تو اسے اڑائے گی

جہاں بھی تیرا جی چاہا تو ساتھ اسے لے جائے گی

روش روش پر، گلی گلی میں کیا کیا ناچ نچائے گی

دیواروں سے دے مارے گی پاؤں سے ٹھکرائے گی

پنکھ اس کے جب جھڑ جائیں گے تو آگے بڑھ جائے گی

دل اک سوکھا پتا جس نے شاخ سے ناتا توڑا
چھوڑ اپنوں کو اس پاگل نے کس سے رشتہ جوڑا''

وزیر آغا پیار اور محبت کے شاعر ہیں۔ زمانے کی بے مروتی، عزیزوں کی دھوکہ دہی، پیاروں کی بے وفائی۔۔ان تجربات نے وزیر آغا کے دل کو ٹھیس پہنچائی اور وہ بے اختیار پکار اٹھے:

پیار کے کچے دھاگے میں اب کون پروئے دل
آیا جھونکا، ٹوٹا دھاگا، بکھر گئی محفل
بچھڑ گئے سب سنگی، ساتھی، ڈوب گئی منزل

کون کسی کا دامن تھامے، کون کسی کا میت
شبنم ایسے کچے رشتے، بادل ایسی پریت
پل بھر برسیں نین رسیلے، پل بھر کا سنگیت

شام چتا میں سورج کی، کیوں اپنا انگ جلائے
رات بے چاری کس کی خاطر، تارے گنتی جائے
پیار کے رشتے کچّے دھاگے، پیار سے ہم بھر پائے

دکھ کی ڈور سے بندھا ہوا ہے یہ سارا سنسار
روتی شبنم، روتا بادل، نینوں کی پھوہار
دکھ جیون کا ساتھی، سنگی، دکھ سے ہم کو پیار''

(پیار)

نفرت کے سنگین تجربات کے باوجود اس نظم سے ظاہر ہے کہ وزیر آغا کو رشتوں کے

کچے پن اور بے مروتی کا دکھ تو ہے لیکن وہ اپنے دل میں پھر بھی محبت کی دولت ہی چھپائے بیٹھے ہیں۔ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ نے وزیر آغا کو نئے سرے سے غور و فکر کا موقعہ دیا۔ انہوں نے رشتوں کی ماہیت پر غور کرنا شروع کر لیا:

''زمانے کی پھیلی ہوئی ڈور میں
چھنی کچی گرہ ہے
گرہ کھل گئی گر
تو کچھ نہ رہے گا!
مگر آج میں سوچتا ہوں
میں خود بھی تو اک ننھی منی گرہ تھا''

(ٹرمینس)

''مگر میں بندیا نہیں ہوں شاید کہ وہ تو تقدیس کا نشاں ہے
دلوں کے دھاگوں کی اک گرہ ہے
گرہ۔ جو صدیوں میں بننے والے حسین رشتوں کا آشرم ہے۔
جو آنے والی تڑپتی صدیوں کی ابتدا ہے
گرہ تو جنکشن ہے پٹڑیوں کا، مسافروں کا، نئی نویلی رفاقتوں کا
محبتوں کا، اذیتوں کا''

(بیکراں وسعتوں میں تنہا)

''رشتے
بانکی موجوں ایسے
لپک، جھپک کر آئیں
پل بھر رک کر
گرہ بنائیں

پھر ساحل کی سِل پر
گر کر کرچ کرچ ہو جائیں‘‘

(اک کتھا انوکھی)

ہندوؤں کی شادی کی رسم میں لڑکی، لڑکے کے پلو اور دامن میں گرہ باندھی جاتی ہے۔ اسلام میں نکاح کا حکم ہے اور لفظ نکاح کا معنی بھی گرہ ہے گویا دو رشتوں کے مابین گرہ باندھنا نئے رشتوں کو (نئی گرہوں کو) کو بناتا چلا جاتا ہے۔ رشتے جڑے رہیں تو صدیوں تک جڑے چلے جائیں اور ٹوٹنے پر آئیں تو پل بھر میں ٹوٹ جائیں۔

بیوی کا رشتہ اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ وہ مرد کے وجود کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ ہوتی ہے۔ وحدت سے دوئی پیدا کرتی ہے۔ ’’من وتو‘‘ کی حقیقت کو آئینہ کرتی ہے۔ ثنویت کا آغاز اسی رشتے سے ہوتا ہے۔ وزیر آغا کے ہاں محبت میں گندھی ہوئی اس ثنویت کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ چند مثالیں دیکھتے ہیں:

’’چار سو اک بحر ناپیدا کنار
سینۂ لرزاں پہ جس کے بے قرار
موجۂ طوفاں، ہوائے شعلہ بار
ناتراشیدہ امنگوں کی جلن
سینۂ سوزاں میں پیہم اک لگن
ہو بہو میری طرح!

اک جزیرہ، خامشی سے ہم کنار
زرد کلیوں، سرخ پھولوں کا دیار
نو دمیدہ آرزوؤں کی بہار
صد حجاباتِ حسیں کی انجمن

بحر کی آشفتگی پر خندہ زن
ہو بہو تیری طرح!‘‘

(من وتو)

’’جانے کب سے باہیں کھولے، رستہ روکے، پیڑ کھڑا ہے!
جانے کب سے
جسم چرائے، آنکھ جھکائے، پگڈنڈی حیران کھڑی ہے!‘‘

(میں اور تو)

’’سیمگوں کلیوں کی ٹھنڈی سیج پر لیٹی ہوئی
صبح۔۔اک سیّال سونے کا طلسم
صبح۔۔جیسے تیرا جسم!

بادلوں کی گرم، بوجھل شال میں لپٹی ہوئی
شام۔۔گہری برف کی بے جان سِل
شام۔۔جیسے میرا دل
شام، بجھتی شام تیرے سامنے
صبح، ہنستی صبح میرے روبرو!‘‘

(نیا سال)

یہاں سے پھر وزیر آغا کی محبت رشتوں کی سطح سے بلند ہونے لگتی ہے اور دعا کا روپ دھار لیتی ہے!

’’اگر میں زمیں کے سیہ تنگ پاتال میں گر بھی جاؤں تو کیا ہے
تجھے تو زمیں کورے کاغذ کی صورت ملے
بیاضِ شب و روز پر دستخط تیرے قدموں کے ہوں

چھلکتے ہوئے تینوں نٹ کھٹ زمانے
ترے گرد ناچیں
تو ہنسی کی تانوں سے ہر شے کو پاگل کرے، نذرِ آتش کرے
توڑ ڈالے
مگر خود نہ ٹوٹے
کبھی تو نہ ٹوٹے!''

(دعا)

محبت میں قربت اور دوری کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ وزیر آغا کی نظموں میں فاصلوں کی کیفیت کے رنگ دیکھیں:

''یہ قربت یہ دُوری!
جو پلکیں اٹھاؤ تو اک قرب باہم
جو پلکیں گراؤ تو اک ہُو کا عالم
وہی آرزوؤں کے بجھتے شرارے
وہی دل وہی دل کا صحرائے اعظم''

(قریب و دُور)

''درختوں کے نیچے
کوئی۔ زرد پتوں، جلی کونپلوں
ادھ کھلی خشک کلیوں کی چادر بچھائے
ترا منتظر ہے!

بتا کون ہے یہ؟
جو اِن گنگ ہونٹوں، بجھی بند آنکھوں

جلے سرد ہاتھوں کے ہوتے ہوئے بھی
ترا منتظر ہے!''

(مسرت)

''تند خُو جُوئے رواں کے پاس کھیتوں سے اِدھر
بھیگے پنچھی کی طرح سہما ہوا ننھا سا گھر
گھر کی چھت پر ایک پیکر، منتظر۔ وقتِ سحر
منتظر۔ اور بے قرار''

(عکس)

محبت کا جذبہ ایک خاص مقام تک وقت کی گرفت میں رہتا ہے اور اس مقام پر وقت کی سفاکی اور بے رحمی دکھ کی ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ وزیر آغا کی نظموں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں:

''کاش میں تیری مسرت کو جواں رکھ سکتا
کاش میں تیرے تبسم کو سہارا دیتا
تا ابد تیری نگاہوں میں لرزتا رہتا''

(ندامت)

''نہ جانے میں اس کالے بے جان پتھر پہ کب سے کھڑا ہوں
مرے سامنے اک بھیانک خلا ہے
خلا جو تری یاد کو کھا گیا ہے''

(تعاقب)

''اِدھر شام کی جوالا ٹھنڈی پڑی اور اُدھر
کہنہ بیسا کھیوں کے سہارے، اپاہج سی اک بڑھیا
بے دانت کے پوپلے منہ سے سیٹی بجاتی ہوئی سامنے آ کے رک سی گئی

اور پھر رات بن کر

تجھے ڈس گئی

پھر مجھے ڈس گئی''

(ڈولتی ساعت)

''گھسی اور اکھڑی ہوئی چھوٹی اینٹوں پہ

مہندی کی سرخی کا مدھم سا کوئی نشاں اب بھی ہوگا

مگر تازہ پھولوں کی پاگل مہک

اور مہکتے لبادے میں اجلا بدن

اور کھنکتی ہنسی

پھر ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا

تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کا مدھر سلسلہ

وہ مدھر سلسلہ اب کہاں ہے

زمانے کے جالے میں محبوس، بجھتی ہوئی یہ صدا

جس کی خاطر تو سنسان زینے کے پہلے قدم پر کھڑا ہے۔

صدا تو نہیں ہے۔

فقط لاش ہے ایک مُردہ صدا کی!''

(واپسی)

''وہ اک تازہ شے

جو تری آنکھ کے نیم وا سے دریچے میں

مٹی کا صدیوں پُرانا دیا بن کے جلتی رہی ہے۔

مگر اب نہیں ہے!''

(وہ اک تازہ شے)

وقت کی بے رحمی کا ادراک ہوتے ہی وزیر آغا کی محبت جسم کی سطح سے پوری طرح اوپر اٹھ آتی ہے۔

''میں پنچھی نہیں ہوں کہ اک پل کے سُکھ کے لئے

تیری پھولوں بھری نرم آغوش کو اپنا مسکن بناؤں

زمانے کو

تیری بھری بزم کے کسمسانے

بڑے زور سے چیخ کر پھڑ پھڑانے کا منظر دکھاؤں

مجھے دُور جانا ہے میں جا رہا ہوں!''

(پرانی بات)

جب ان کی ذات پوری کائنات سے ہم آغوش ہوتی ہے اور اس کے بھید اور اسرار ان پر منکشف ہونے لگتے ہیں تو پھر وقت بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے:

''مجھ کو محسوس ہوتا کہ سارا فلک

ایک ٹوٹا ہوا آئینہ ہے

ستارے، چمکتی ہوئی کرچیاں ہیں

میں خود

ہر ستارے کی کرچی میں ہوں

جیسے کمسن زمیں

اور بوڑھا فلک

اور معصوم تارے

سبھی میرے ہم راز

سب میرے اپنے ہیں

میں، سبز مخمل کی مسند پہ

بیٹھا ہوں
تینوں زمانے
مرے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں''

(آدھی صدی کے بعد)

یہاں بڑی دلچسپ صورتحال پیدا ہوتی ہے، ایک طرف تو وزیر آغا کی محبت جسم کی سطح سے اوپر اٹھ آتی ہے اور وہ رشتوں سے بڑھ کر فطرت کے مظاہر اور مناظر سے ایک تعلق قائم کرنے لگتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ دوبارہ ان مظاہر اور مناظر کو جسم کی حدود میں لے آتے ہیں، شام، رات، تارے، سورج، پیڑ، پودے، خوشبو، ہوا، بادل، بجلی، خاموشی، سناٹا، گلی، انگیٹھی، روایت، نفرت۔۔ یہ سارے مظاہر، مناظر اور جذبے وزیر آغا کی نظموں میں انسانوں کی طرح اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں:

''آنکھ مچولی کھیلتے تاروں کی سن کر چہکار
کچی نیند سے رات کی رانی جاگ اٹھی یکبار
تاروں نے دم سادھ لیا بُت بن گئے سب اشجار

گجرے پہنے، بال سنوارے، چپل دئے اتار
سندر آنچل سر پر لے کر ہوگئی وہ تیار
ننگے پاؤں جھجکتی ڈرتی، چلی پیا کے دوار

اک پتھر پر اکڑوں بیٹھا سوچ رہا ہوں یار
رات بچاری ہر شب یونہی ہوتی ہے تیار
آخر میں اک بھیگا آنچل اور اشکوں کے ہار''

(نارسائی)

''بہت دور جاتا ہوا کوئی پنچھی
کسی دم بخود پیڑ کو اپنا مسکن بنائے
تو اس پیڑ کی نرم، لچکیلی شاخیں
بگڑ کر، بُرا مان کر کسمسائیں''

(پرانی بات)

''تب رات خوشبوؤں میں نہائی ہوئی اٹھی......
تاروں کی ہانپتی ہوئی بارات ڈھل گئی
بوڑھی گلی میں دھیرے سے چپ خیمہ زن ہوئی
کھڑکی کی آنکھ کیا بجھی، دنیا بدل گئی
دکھ اوٹ سے کواڑ کے میرے طرف بڑھا''

(دکھ)

''وہ صدیوں سے
بڑھتے ہوئے وقت کے راستے میں
لبوں کو سیئے، دم بخود، بے سہارا کھڑی ہے''

(روایت)

رات سیہ چادر میں تن کے بھید چھپائے
اندھے غار سے باہر آ کر
اپنا سب کچھ ہار گئی ہے''

(فشار)

''وہ ہنسی
زہر میں ڈوبے ہونٹوں نے مجھ سے کہا:
تو یونہی ڈر گیا

میں ۔۔ہوا
دور پربت پہ میرا نگر‘‘

(المیہ)

’’اور پھر اک دن ظالم سورج
اپنی خونی آنکھ سے مجھ کو گھور رہا تھا‘‘

(سنگِ زرد)

’’گہری، نیلی آنکھ تھی اس کی
سبزی مائل رنگ
ٹیڑھی، ترچھی ناک کے نیچے
کُھلے ہوئے جبڑے سے نکلے
بھیڑیئے ایسے لانبے دانت‘‘

(نفرت)

’’نٹ کھٹ، بانکی، تیز سی خوشبو
ناچ ناچ کر ہاری
پھر جب مست ہوئی
چِت لیٹ گئی!‘‘

(بوجھل خوشبو)

’’شام نے دیکھا کہ یہ پہلا ستارہ
پیش رو تھا ان ستاروں کا
جواَب چاروں طرف اُگنے لگے
دائرے میں اس کو لے کر
دکھ سے بوجھل، کرب میں گوندھی ہوئی آواز میں

کہنے لگے:
ہم تجھے مرنے نہ دیں گے
ہم تجھے مرنے نہ دیں گے
ہائے تو کیسے گری
باجی تو کیسے گر پڑی!‘‘

(ایک شام)

’’بدن اس کا ہزاروں سرخ پھولوں سے فروزاں تھا
تمازت اور خوشبو۔۔دو جواں سکھیاں
اسے سرگوشیوں میں چھیڑتی تھیں‘‘

(انگیٹھی)

’’وہ۔۔دو بھائی
ایک ہی جڑ سے انکھوے
بن کر پھُوٹے
اک نے پیڑ کا سوانگ رچایا
دوسرا۔۔تنگ کلاوے میں سے
زور لگا کر نکلا۔۔اور آزاد ہوا‘‘

(بن باس)

وزیر آغا کی محبت کا سلسلہ اپنی ذات سے شروع ہوا۔ رشتوں میں تقسیم ہوا، پھر رشتوں کی سطح سے آگے بڑھا اور مناظرِ فطرت تک پہنچا۔ بے جان اشیاء میں جان سی پڑ گئی لیکن عشق کی طلب بے انت ہوتی ہے اور منزل نا معلوم ۔۔وزیر آغا کی محبت مختلف مدارج سے گزر کر اب اس نا معلوم عظیم ہستی کی کھوج میں ہے جو ساری محبتوں کا منبع اور مرکز ہے، ساری محبتیں وہیں سے پھوٹتی ہیں اور وہیں پہنچتی ہیں مگر اس عظیم ہستی کے بھید کو کون جان سکا ہے؟۔۔اسے تو ہمیشہ مجاز کے وسیلے

سے ہی سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ مجاز کا وسیلہ سہی۔۔ تلاش اور جستجو ڈھونڈنے والے کی محبت اور خلوص کی گواہی تو دیتی ہے۔ وزیر آغا کی ایک نظم سے ایسی گواہی دیکھئے:

''عجیب ہے یہ سلسلہ
یہ سلسلہ عجیب ہے
ہوا چلے تو کھیتیوں میں دُھوم چہچہوں کی ہے
ہوا رُکے تو مُردنی ہے
مُردنی کی راکھ کا نزول ہے
کہاں ہے تُو؟
کہاں ہے تُو؟
کہاں نہیں ہے تُو۔ بتا!
ابھی تھا تیرے گرتے، اُڑتے آنچلوں کا سلسلہ
اور اب افق پہ دور تک
گئے دنوں کی دُھول ہے
گئے دنوں کی دُھول کا یہ سلسلہ فضول ہے

میں رو سکوں تو کیا یہ گدلی کائنات دُھل سکے گی
میرے آنسوؤں کے جھاگ سے؟
میں مسکرا سکوں
تو کیا سفر کی خستگی کو بھول کر یہ کاروانِ نجوم کے
برس پڑیں گے موتیے کے پھول بن کے
اس مہیب کاسۂ حیات میں؟
نہ تو سنے نہ میں کہوں

نہ میرے انگ انگ سے صدا اٹھے
یونہی میں آنسوؤں کو، قہقہوں کو
اپنے دل میں دفن کر کے
گم
لبوں پہ سِل دھرے
ترے نگر میں پا پیادہ، پا برہنہ
شام کے فشار تک رواں رہوں
مگر کبھی تری نظر کے آستاں کو
پار تک نہ کر سکوں
کہ تُو ازل سے تا ابد
ہزار، صد ہزار آنکھ والے وقت
کی نقیب ہے
یہ سلسلہ عجیب ہے
یہ سلسلہ عجیب ہے!!''

(عجیب ہے یہ سلسلہ)

اس عظیم ہستی کی محبت اور جستجو میں ''ہوا'' کی علامت بڑی خوبصورتی سے آئی ہے۔ اس علامت کو محبت کی بالائی سطح سے ہٹ کر دیکھتے ہیں تو اس کے دو روپ نمایاں ہوئے ہیں، ایک تعمیری روپ اور ایک تخریبی روپ۔ پہلے تخریبی روپ کی چند مثالیں:

''ہوا۔ خشک پتوں، پھلوں، بوٹیوں
مُردہ پھولوں کی بُو سے کچھ اس درجہ بوجھل ہے، چلتے ہوئے ہانپتی ہے
کبھی اس کی کڑوی کسیلی تمازت سے نتھنوں کو تم آشنا تو کرو
کبھی اس بھیانک سیہ موت کا سامنا تو کرو''

(مشورہ)

''رات آئی تو نٹ کھٹ جھونکا ہو گیا پھر پاگل
کچے ہو گئے زخم پرانے، ٹھہر گیا ہر پل
وہی ہوا کی وحشی چھاگل، وہی برستا جل''

(ریاکار)

''ہوا کچوکے لگا کے کہتی ہے: تم ابھی سانس لے رہے ہو؟
ہوا سے کیسے کہوں کہ میری یہ سانس تو ایک واہمہ ہے''

(ہوا اگر میرا روپ دھارے)

''مگر جھونکا کہ اک صحرائی بدّو ہے
کبھی خیموں کی جانب چور قدموں سے نہیں آتا
دہکتی سرخ آنکھوں
تیز لانبی برچھیوں سے لیس ہو کر
اک سیہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ سے لپٹا
وہ آتا ہے۔۔تو دھرتی کانپ اٹھتی ہے''

(کون اس کو روک سکتا ہے!)

''ہوا سے کہنا
خدارا، اتنی نہ تیز آئے
کہ سبز پتے
لچکتی شاخوں سے ٹوٹ کر گر پڑیں
زمیں پر''

(ہوا سے کہنا)

اب ''ہوا'' کے تعمیری روپ کی چند مثالیں دیکھیں:

''ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے
کبھی سرِ کوہ اس کا مسکن
کبھی سمندر کی ہم نشیں ہے
ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے''

(آوارہ)

''یہ اک سرد جھونکا جسے تم نے آوارہ پنچھی کہا ہے
یہی زندگی ہے
اسی سرد جھونکے سے دنیا بنی ہے''

(زندگی)

''مری سانس کا سلسلہ
ایسے ٹوٹے۔۔کہ اک مست جھونکے کے مانند گرتی، لڑھکتی ہوئی عمر میری
ہری، لانبی، مخمل سی، خوشبو بھری گھاس میں
اپنے ننگے بدن کو اتارے''

(نروان)

''ہوا کہتی رہی آؤ
چلو اس شاخ کو چھو لیں
ادھر، اس پیڑ کے پتوں میں چھپ کر تالیاں پیٹیں
گریں، اٹھیں، لڑھک کر نہر میں اتریں، نہائیں
مخملیں سبزے پہ ننگے پاؤں چل کر دور تک جائیں''

(ہوا کہتی رہی آؤ۔۔۔)

''ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے
بدن کو تولا

چہک اٹھے شاخ شاخ پتّے
چمکتا کانسی کا چاند۔۔بولا!
پروں کا اجلا سا لمس
میرے بدن پہ اترا تو میں بھی زندوں کی
صف میں آیا''

(ہوا کے جھونکے نے پنکھ کھولے)

''پرندہ ہوا ہے
ہوا سانس ہے
سانس چھاتی کے پنجرے میں آنے کا
اور لوٹ جانے کا اک سلسلہ ہے
میں اس سلسلے کے پراسرار سے زیروبم میں رواں ہوں''

(ازل سے ابد تک)

کسی نقاد نے لکھا تھا کہ وزیر آغا کے ہاں ''ہوا'' کی علامت کا تخریبی پہلو نمایاں ہے مجھے وزیر آغا کی نظموں کے مطالعہ کے دوران معلوم ہوا کہ ان کی نظموں میں ہوا کے تخریبی اور تعمیری دونوں پہلو موجود ہیں۔ حساب کتاب کی اول تو ضرورت نہیں لیکن اگر کیا بھی جائے تو ہوا کا تعمیری پہلو زیادہ بیان ہوا ہے ور اسکے تخریبی پہلو میں بھی مجموعی طور پر ایسے انہدام کی کیفیت ہے جو نئی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ ہوا کے دونوں رخ دراصل وزیر آغا کے ثنویت کے تصور کا شعری اظہار ہیں۔ ثنویت جس سے زندگی کا حسن اور اس کے سارے رنگ قائم ہیں۔

ابھی تک میں نے وزیر آغا کی شاعری کے بنیادی موضوع محبت اور بعض علامتوں کی حد تک ان کی نظموں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اب ان کی چند ایسی نظمیں دیکھیں جن میں موضوعاتی حوالے کے بغیر بھی شعری حسن اپنا کمال دکھا رہا ہے۔ کیا جدید اردو نظم کی یہ حسن کاری وزیر آغا کے علاوہ کسی اور نظم نگار میں نظر آتی ہے؟

''عجب جادو بھری آنکھیں تھیں اس کی
وہ جب پلکیں اٹھا کر اک نظر تکتی
تو آنکھوں کی سیہ جھیلوں میں
جیسے مچھلیوں کو آگ لگ جاتی
ہزاروں سرخ ڈورے تلملا کر جست بھرتے
آبِ گم کی قید سے باہر نکلنے کے لئے
سو سو جتن کرتے''

(دیوار گریہ)

''عجب وہ شخص تھا
زہرہ، زمیں، مریخ۔ سب
سورج کو کعبہ جان کر قربان ہوتے ہیں
مگر وہ شخص تو
اپنے ہی مرکز پر
نجانے کب سے گرداں تھا
سنا ہے کوئی سورج
اس کے اپنے تن کے اندر جل اٹھا تھا
وہ جس کے گرد
شب بھر گھومتا تھا''

(عجب وہ شخص تھا)

''تو آؤ۔ قریب آ کے دیکھو
کہ میں تو ہزاروں برس سے
شب و روز ساحل کی جانب

تمہاری ہی جانب
امنڈ تا رہا ہوں
کبھی میں نے سوچا نہیں تھا
کہ اک روز جب میں چٹانوں کے قدموں میں
ساحل کی بھیگی ہوئی ریت پر آ کے بچھنے لگوں گا
تمہارے قدم چھو سکوں گا''

(اگر آج تم!)

وزیر آغا کی طویل نظمیں ''آدھی صدی کے بعد''، ''اک کتھا انوکھی''، ''ٹرمینس'' اور 'الاؤ'' جدید اردو نظم میں خوبصورت اور انوکھا اضافہ ہیں۔ پہلی دو نظموں پر تو میں الگ سے تفصیلی مضمون لکھ چکا ہوں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مجھے وزیر آغا کی بعض ابتدائی نظموں میں ان طویل نظموں کے امکانات نظر آئے ہیں۔ ''واپسی'' کے عنوان سے وزیر آغا کی دو چھوٹی نظمیں کلیات کے صفحہ 283 اور 496 پر درج ہیں۔ یہ نظمیں ''آدھی صدری کے بعد'' کا پیش خیمہ تھیں کیونکہ 'واپسی' کے جو تجربے ان نظموں میں ہوئے انہوں نے وزیر آغا کو پچاس سال کے بعد پھر یادوں کی واپسی کا منظر دکھایا اور یوں اردو نظم کو ''آدھی صدی کے بعد'' جیسی شاہکار نظم عطا کی۔

''جب اور اب'' (صفحہ 264) اور ''ترغیب'' (صفحہ 389) دو الگ الگ موضوعات کی نظمیں ہیں۔ ''جب اور اب'' میں دل کی آواز کی اہمیت ظاہر کر کے اس دکھ کا اظہار کیا گیا ہے کہ اب دل کی آواز کوئی نہیں سنتا۔ ''ترغیب'' میں آہنی شہر میں ملوں، بلڈوزروں اور لوہے کے جھولوں کے ذریعے IRON AGE کا المیہ بیان ہوا ہے۔ لیکن نظم کا اختتام ان لائنوں پر ہوتا ہے:

کبھی تم جو آؤ
تو میں تم کو پلکوں پہ اپنی بٹھاؤں
تمہیں اپنے سینے کے اندر کا منظر دکھاؤں

گویا دنیا کی ہاہا کار میں بھی دل کی آواز، اندر کی آواز ابھی زندہ ہے۔ یہی دونوں نظمیں

آگے چل کر ''اک کتھا انوکھی''، جیسی اعلیٰ نظم کی تخلیق کا سبب بنیں۔

اسی طرح نظم ''آویزش'' (ص 441) میں مجھے طویل نظم ''الاؤ'' کے امکانات نظر آئے ہیں میرا خیال ہے وزیر آغا کے ہاں اس تسلسل کو دریافت کرنے کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ واضح ہے کہ خیال کے دیگر ممکنات کے کھل کر سامنے آنے کے باوجود وزیر آغا نہ صرف خود کو دہرانے اور بے جا تکرار سے محفوظ رہے ہیں بلکہ نئی نئی علامتوں اور استعارات کے ذریعے ان کی نظموں کی تازگی بھی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔

جدید اردو نظم کا اب تک کا سفر راشد (لا=انسان) کے ہاں انسان کی نفی سے شروع ہو کر وزیر آغا کے ہاں انسان کے اثبات تک کی روداد ہے۔ مجید امجد کی زندگی میں اس کی تفہیم پر توجہ نہیں دی گئی تھی لیکن اب مجید امجد کو سمجھا جانے لگا ہے۔ جب مجید امجد کو پوری طرح سمجھ لیا جائے گا تب وزیر آغا کی نظموں کی اہمیت اور عظمت کا بھی کھل کر اعتراف کیا جائے گا کیونکہ وزیر آغا کی نظم مجید امجد کی نظم سے آگے کی تخلیق ہے۔ تب ادبی سیاستدانوں کی سیاست گری کا طلسم وزیر آغا کی تخلیقات کے سامنے اسی طرح دھواں ہو جائے گا جس طرح مجید امجد کی نظم کے سامنے ہَوا ہو گیا ہے۔

مستقبل میں وزیر آغا کی نظم کو جو اہمیت اور عظمت ملنے والی ہے میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور خلوص دل سے اس عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں!

وزیر آغا کی غزلیں

وزیر آغا کی غزلوں پہ بات کرنے سے پہلے مجھے ذوقؔ اور غالبؔ کے دور کی طرف ایک سرسری نظر سے دیکھنا ہے۔ ذوقؔ اپنے دور کا تسلیم شدہ ملک الشعراء تھا بادشاہ کے دربار میں اس کی رسائی تھی۔ شاہی مراعات اس کا نصیب تھیں۔ قصیدہ گوئی اس کا فن تھا اور اسی فن کی کمائی نے اسے ظاہری عزت اور شان وشوکت عطا کر رکھی تھی۔ اپنے عہد کا عظیم شاعر بنا رکھا تھا۔۔ ذوقؔ کے مقابلے میں غالبؔ پر پھبتیاں کسی گئیں۔ اس کے تو شعر ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ موصوف مشکل پسند بن رہے ہیں۔ ان کا لکھا یہ آپ ہی سمجھیں تو سمجھیں اور کسی کو تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا یہ غزل کے شعر ہیں وغیرہ۔۔ وقت نے کروٹ لی۔ ذوقؔ، اپنی شاعری سمیت اپنے عہد کے ملبے میں دب کر رہ گیا اور غالبؔ اپنے عصر کو عبور کرتے ہی نہ صرف قابلِ فہم ہو گیا بلکہ زندہ جاوید بھی ہو گیا۔ غالبؔ کے مقابلے کے ''درباری'' ملک الشعراء اب غالبؔ کے آدھے قد کے شاعر بھی نہیں مانے جاتے۔ **(فاعتبرو یا اُولی الابصار)**

وزیر آغا کی غزل پر سچا فیصلہ تو آنے والا وقت دے گا۔ وقت بتائے گا کہ وزیر آغا کی غزل اپنے عصر کو عبور کر کے زیادہ بامعنی ہوئی یا نہیں تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ وزیر آغا کو بھی اپنے عہد کے ذوقؔ کا تلخ سامنا ہے۔ اس عہد کا ذوقؔ بھی سرکار کا ''درباری شاعر'' ہے۔ دربار میں رسائی کے باعث تمام ذرائع ابلاغ کے دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ تمام انعام واکرام کی بارشیں اسی کے لئے یا اسی کی مرضی سے ہوتی ہیں، لیکن وزیر آغا کو اس کی درباری حیثیت پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ وزیر آغا نے تسلیم کیا ہے۔

سرشت اس کی قصیدہ، غزل مزاج مرا   قریب لا کے بھی ہم جُدا جُدا رکھنا

اس کے باوجود اس عہد کے ذوقؔ کی طرف سے وزیر آغا کی شاعری اور بالخصوص غزل کے بارے میں قریب قریب وہی الزامات اور طعنے دہرائے گئے جو غالبؔ کو دیئے جا چکے تھے۔ بلکہ ذوقؔ کے حواریوں نے تو کردار کشی کی مہم میں پرانے ہجوگوؤں کی ہزلیات کو بھی مات کر دیا۔ وزیر آغا نے اس عہد کے ذوقؔ کے اشاروں پر چلائی جانے والی مہم کو اخلاقی گراوٹ اور پوری انسانیت کی تذلیل سے تعبیر کیا:

گرا وہ شخص تو ہم بھی گرے تھے ساتھ اس کے
ملی سزا تو شریک اس سزا میں تھے ہم بھی

میں اس تمہید طولانی کے لے معذرت خواہ ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ منفی پروپیگنڈہ کی اصل حقیقت کو سامنے رکھ کر حقائق کو پرکھا جائے تو سچائی تک پہنچنے میں آسانی رہتی ہے۔ وزیر آغا کی غزل کی سچائی کو اس سارے پس منظر میں اب بہتر طور پر دیکھا اور پرکھا جا سکے گا۔

زخمی ہرن کی چیخ اور عورتوں سے باتیں یا عورتوں کی باتیں کرنے والی غزل جب طوائف کے کوٹھے سے اتری تو اسے کھیتوں، کھلیانوں، کارخانوں، شہروں، گلیوں، بازاروں کی سیاحت کرائی گئی اور غزل نے ان کے موضوعات کو بھی اپنے اندر سمو لیا۔ زندگی امیر غریب کی جدوجہد سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔ غزل نے جب نئے علوم، نئے انکشافات، نئی ایجادات اور نئی تحقیقات کی طرف توجہ کی تو ان کے موضوعات بھی غزل کے وسیع دامن میں آتے چلے گئے۔ یوں غزل ایک طرح سے پوری زندگی کی ترجمان بن گئی۔ تاہم موضوعات کے تنوّع کے باجود غزل میں جذبہ اور تخیل کی حکمرانی رہی جذبہ اور تخیل کے توازن نے ہی غزل کے شعر کو غزل کا شعر بنایا۔

وزیر آغا کی غزل میں جذبہ اور تخیل کا توازن بڑے خوبصورت انداز میں ابھرا ہے۔

ہے تمنا کہ سدا برسرِ پیکار رہیں
تم مقابل رہو ہم آئینہ بردار رہیں

اتنا نہ پاس آ کہ تجھے ڈھونڈتے پھریں
اتنا نہ دور جا کہ ہمہ وقت پاس ہو

آہستہ بات کر کہ ہوا تیز ہے بہت
ایسا نہ ہو کہ سارا نگر بولنے لگے

عجیب طرزِ تکلّم ہے اس کی آنکھوں کا
خموش رہ کے بھی لفظوں کی دھار پر رہنا

رکھ ان کو تُو بچا کے کسی اور کے لئے
یہ قول یہ قرار ترے کام آئیں گے

دل کہ ہے راستے کا اک پتھر
آؤ اس کوہِ غم کو پار کریں

چاند ہو روز بدلتے ہو تمہارا کیا ہے
میں سمندر ہوں ابد تک نہ بہکنے والا

جرم تھا میرا کہ میں نے جرم میں شرکت نہ کی
تھی مری تقصیر بس اتنی کہ بے تقصیر تھا

غزل میں وزیر آغا کے موضوعات کا تعین کرنا، بلکہ کسی بھی تہہ دار شاعر کی غزل کے موضوعات کا تعین یا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ تاہم ہم ان کی غزل کے بعض پرتوں کے مضامین کو ایک

حد تک معنی کی گرفت میں لا کر مس ضرور کر سکتے ہیں۔ محبت ہمیشہ سے غزل کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ اس حوالے سے وزیر آغا کے چند اشعار دیکھتے ہیں:

دل بضد ہے کہ گنگنائیں تجھے
آنکھ کہتی ہے بھول جائیں تجھے

چاپ ابھری ہے دل کے اندر سے
کوئی پلکوں پہ آنے والا ہے

کپکپانے لگے ہیں لب اس کے
جانے کیا بات کرنے والا ہے

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

جو دل میں پھانس تھی سو رہ گئی ہے
بیاں ورنہ سبھی کچھ ہو گیا ہے

اس بے وفا سے ترکِ تعلق کی دیر تھی
جینا بھی اور مرنا بھی آسان ہو گیا

اس کی آواز میں تھے سارے خدوخال اس کے
وہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پروبال اس کے

محبت کا تخلیقی عمل، جنسی عمل ہے۔وزیر آغا کے ہاں عموماً جنسی جذبہ لطیف صورت اختیار کر جاتا ہے مگر کہیں کہیں جنسی جذبے کا اظہار سطح پر بھی آ جاتا ہے۔

کیا لمس تھا کہ سارا بدن جگمگا گیا
پردے ہٹے، نقاب اٹھے، فاصلہ گیا

ہم سے بھی پوچھتا کوئی سرکش لہو کا راز
اپنے بدن کے مالک ومختار ہم بھی تھے

وہ ایک شخص کہ تاروں کی لو تھا جس کا بدن
کبھی کبھی وہ زمیں پر اترنے لگتا تھا

وہ پرندہ ہے کہاں شب کو چہکنے والا
رات بھر نافۂ گل بن کے مہکنے والا

اُس کا بدن تھا خون کی حدّت سے شعلہ وش
سورج کا اک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

محبت کے روحانی اور جسمانی حوالوں سے ہٹ کر وزیر آغا کی غزل میں سفر کی علامت بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔سفر کی کئی جہات ہیں۔اشعار سے ان جہات کا اندازہ لگائیے:

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا، رواں مشتِ پر میں تھا

سفر کا رخ ہے تمہاری طرف وگرنہ مجھے

پلٹ کے جانا کبھی باعث ملال ہوا؟

اے تھکے ہارے مسافر کچھ بتا
اور کتنی دور اب جائے گا تو

بھول ہی گیا آخر اپنا دیس اپنا گھر
وہ ہوا کا ہم سفر دربدر ہی ایسا تھا

نکل پڑے ہو سفر کو تو شاہراہ کے ساتھ
کسی کی یاد کے کتبے جگہ جگہ رکھنا

ایسے بڑھے کہ منزلیں رستے میں بجھ گئیں
ایسے گئے کہ پھر نہ کبھی لوٹنا ہوا

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں ہم
یہ رستہ دیر سے سونا پڑا

وزیر آغا کی غزل میں سب سے زیادہ مظاہر فطرت کی علامتیں آئیں ہیں۔وزیر آغا خود دھرتی سے جڑے ہوئے ہیں۔مٹی کی خوشبو، جنگل، کھیت، میدان، درخت، پودے، پھول، پتے، گھاس، پرندے، تتلیاں، صبح، شام، دوپہر کے مناظر یہ سب وزیر آغا کی غزل میں بڑے فطری انداز میں در آئے ہیں اور خود بولتے نظر آتے ہیں:

ہر ایک پیڑ ہے منقار زیر پر اب تو
وہ شام کیا ہوئی جب ہر شجر چہکتا تھا

درختوں کو تو چپ ہونا تھا اک دن
پرندوں کو مگر کیا ہو گیا ہے

شام کا تارا دیکھتے ہی جب جنگل رونے لگتے ہیں
پنچھی ہم کو چابی والے سبز کھلونے لگتے ہیں

آنسو، ستارے، اوس کے دانے، سفید پھول
سب میرے غم گسار سرِ شام آئیں گے

آندھی کے چابکوں سے ہرے پات جھڑ گئے
جو بچ گئے وہ آپ ہی شاخوں پر سڑ گئے

پھولوں بھری ردا کو کہاں لے گئی ہوا
رستے کے ہر مسافر خستہ قبا سے پوچھ

دھرتی کے مظاہر فطرت کی علامتوں کا اظہار وزیر آغا کے ہاں اتنا قوی ہے کہ آسمانی مظاہر کے لیے بھی اسی لفظیات کو برتتے ہیں اور ایک مقام پر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان بھی دھرتی کا حصہ ہے اور محبوب بھی دھرتی کا حصہ ہے۔

چاندنی اس کا بدن، چاند ہے اس کا چہرہ
دھان کی کھیتیاں آنکھوں کے حسیں تال اس کے

آئے وہ دن کہ کشتِ فلک ہو ہری بھری

بنجر زمیں پہ میلوں تلک سبز پہ میلوں تلک سبز گھاس ہو!

آسماں پر اَبر پارے کا سفر میرے لئے
خاک پر مہکا ہوا چھوٹا سا گھر میرے لئے

اوپر بجھے ستاروں کی بکھری ہوئی تھی راکھ
نیچے گھنے درختوں کا جنگل جلا ہوا

آسمان کو دھرتی جیسا محسوس کرنے کا انداز غزل کے مقابلے میں وزیر آغا کی نظم میں زیادہ واضح ہے۔

''کہو کون تھا وہ؟
کہ جس نے کہا تھا
ستارے فقط پات ہیں
کہکشائیں
گندھی نرم شاخیں ہیں
آکاش
اک سبز چھتنار
ہر شے پہ سایہ کناں ہے
مگر اس کی جڑ
اس کے اپنے بدن میں
نہیں ہے!''
(آدھی صدی کے بعد)

یہ سب وزیر آغا کی دھرتی سے قربت اور مظاہر فطرت سے ان کی محبت کے اظہار کی

صورتیں ہیں۔ جدید خلائی تحقیقات اور نت نئے انکشافات بھی وزیر آغا کی غزل پر اثر انداز ہوئے ہیں۔

کیسے کہوں کہ میں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ، زمیں بے لباس تھی

تم گود سے زمین کی اترے تو ہو مگر
کھیلو گے کس کے ساتھ خلا کے غبار میں

کائنات کی بے پناہ وسعت کا احساس، کہکشاؤں کے کروڑوں، اربوں جھرمٹ، سپر نووا، نیوٹران اسٹار، بلیک ہولز اور پھر ان سے بھی آگے ہی آگے ایک بے انت سلسلہ! اس سارے سلسلے میں ہماری زمیں۔۔کیا حیثیت رکھتی ہے۔

اک پرندہ ہے یہ زمیں، دیکھیں
کس شجر پر یہ بے زباں پہنچے

اور باقی اربوں کھربوں ستاروں کی کیا حیثیت بنتی ہے:

کہکشاؤں میں تڑپتے تھے ستاروں کے پرند
سبز آکاش پہ ہر سو تھے بچھے جال اس کے

بنائے تو نے ستاروں سے گھر ہزاروں بار
مگر ہوا نہ کبھی تجھ سے آسماں آباد

یہ کائنات اتنی بے انت اور بے پناہ ہے تو خالق کائنات کیا ہوگا؟ خدا کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہم نے صفات کے وسیلے سے اسے سمجھنے اور اس تک پہنچنے کی کوششیں کی ہیں۔ خدا کو سمجھنے کے لئے حضرت علیؓ کا ایک قول بڑا منفرد اور اہم ہے:

''**کمال التوحید نفی عن الصفات**'' توحید کا کمال تب ظاہر ہوتا ہے جب

صفات کی بھی نفی ہو جائے۔ صفات بھی بہت نیچے رہ جائیں۔ وزیر آغا نے توحید کی اس رمز کو سمجھا ہے اور بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

رنگ اور روپ سے جو بالا ہے
کس قیامت کے نقش والا ہے

میں وزیر آغا کی غزل کے علامتی نظام کی وضاحت یا اشعار کی تشریح میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں نے وزیر آغا کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جو لطف اٹھایا ہے بس اس میں قارئین کو بھی شریک کرنا چاہا ہے۔ اس کاوش میں کہیں کوئی وضاحت یا تشریح ہوتی محسوس ہوئی ہو تو ایسا بلا ارادہ ہوا ہے۔ میرا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ غزل کے اچھے قاری وزیر آغا کی غزل کو دیکھیں اور بغیر مطالعہ کے یک طرفہ ''ذوقی'' پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر کوئی نتیجہ نکالنے سے پہلے ان غزلوں کو پڑھ لیں۔ آیئے وزیر آغا کی غزلوں کے چند اشعار پڑھتے ہیں:

دامن دریدہ تم ہی نہیں تھے فقط وہاں
بے آبرو کھڑے سر بازار ہم بھی تھے

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

لکھا گیا ہوں لوح بدن پر ہزار بار
کاتب بدل گئے ہیں مگر میں قدیم ہوں

اپنی عریانی چھپانے کے لئے
تو نے سارے شہر کو ننگا کیا

سحر تھی سادہ ورق، آفتاب کاتب تھا
ظہورِ عالمِ امکاں کتاب ایسا تھا

بے خطا بھی تو گزرا ہے زمانہ ہم نے
اب خطا کار ہوئے ہیں تو خطا کار رہیں

آنکھ بے پردہ تھی اس کی، ہونٹ بے زنجیر تھا
سلسلہ الفاظ کا چلتی ہوئی شمشیر تھا

اک تم ہو جو دکھ کو ٹھوکر مار کے آگے بڑھتے ہو
اک ہم ہیں جو سینے میں اس دکھ کو بلونے لگتے ہیں

مجھ سے بچھڑا تو ہوا اس کو نہ پھر چین نصیب
کبھی فرسنگ، کبھی کتبۂ فرسنگ تھا وہ

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارا بھی ہے جانے والا

ہزاروں بار پہلے بھی گرے تم
مگر اس بار پتھر ہو گئے ہو

کس کی آواز میں ہے ٹوٹتے پتوں کی صدا

کون اس رُت میں ہے بے وجہ سسکنے والا

چلتا رہا ہوں اپنی ہی جانب تمام عمر
تو نے غلط کہا کہ میں گھر سے نکل گیا

اک بار ہم نے پار کیا چُپ کا ریگ زار
پھر عمر بھر اٹے رہے لفظوں کی دُھول میں

مجھے یقین ہے وزیر آغا کی غزل اپنے عصر کو عبور کرنے کے بعد زیادہ بامعنی ہو جائے گی اور ایک عرصہ تک اس کے منفرد لہجے اور ذائقے سے نئی غزل کی عزت اور توقیر بنی رہے گی۔ میں اس عہد کے ''ذوق'' کا دور گزرنے کے بعد کے زمانے کی بات کر رہا ہوں۔

وہ زمانہ جس کے قدموں کی چاپ ابھی سے سنائی دے رہی ہے!

پہلا ورق

عہد آفریں رسالہ ''اوراق'' کے اداریوں کا یہ مجموعہ غالباً کسی ادبی جریدے کے اداریوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ آج سے چند برس پیشتر لاہور کے ایک ادبی رسالے کے متشدد اداریے کے بعد جب مَیں نے ''اوراق'' کے سابقہ شماروں کے اداریے پڑھے، تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کی اداراتی زبان بے حد شائستہ ہے اور اختلافی مسائل پر بھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا اور نہ ہی اس کا لہجہ کہیں عدم توازن کا شکار ہوا ہے۔ میں نے اپنی اس ادبی خوشی میں ڈاکٹر پرویز پروازی کو شریک کیا تو انہوں نے تجویز کیا کہ یہ اداریے اگر بکھری ہوئی حالت سے یک جا کر کے کتابی صورت میں پیش کیے جائیں، تو ادب کے سنجیدہ قارئین اور اہلِ علم کے لیے یہ کتاب دلچسپی کا باعث ہوگی۔ ''پہلا ورق'' کو کتابی صورت مُیں پیش کرنے کے خیال کو فرحت نواز نے بھی سراہا۔ احباب سے حوصلہ پا کر میں نے ''اوراق'' کے ''شمارہ ستمبر اکتوبر 1981ء میں شائع ہونے والے اپنے ایک خط میں اس خواہش کا اظہار کیا۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ کراچی کے ایک گرلز کالج کی لیکچرر ناہید سلطانہ صاحبہ نے بھی اسی شمارے میں ''اوراق'' کے اداریوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کی کتابی صورت میں اشاعت کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ میں نے تب ہی سے ''اوراق'' کے اداریوں کی ترتیب کا کام شروع کر دیا۔ رفتار قدرے سُست تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ضیاء شبنمی نے پھر اس کتاب کی اشاعت پر زور دیا تو میں نے کام کی رفتار تیز کر کے ضروری سمجھا کہ یہ کتاب اب منظرِ عام پر آ جائے۔

''اوراق'' کے اداریے ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا اظہار ہیں۔ مختلف ادبی مسائل پر ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑی عالمانہ گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو اوراق کے اداریے پڑھنے والوں کو تخلیقی زاویۂ نظر

عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''اوراق'' میں شائع ہونے والی تخلیقات اور ''پہلا ورق'' کے مزاج بڑی حد تک ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ یوں ''اوراق'' صرف مرتب کردہ رسالہ نہیں رہتا، بلکہ جدیدیت کا رہنما ایک ایسا بڑا ادبی جریدہ بن جاتا ہے جس کے پیچھے ایک مضبوط علمی شخصیت مدیر کی حیثیت سے کام کرتی نظر آتی ہے۔

تخلیقی سچائی کے اظہار میں ''اوراق'' نے آسمان کو نظر انداز نہیں کیا، لیکن زمین کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا۔ ارضِ پاک کی نفی کرنے والے بعض عناصر نے جب اس معاملہ کو جذباتی نعرہ بازی کی گرد میں اڑانا چاہا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے جھنجھلاہٹ کے بغیر علمی سطح پر اپنے موقف کی وضاحت کی اور فیاض محمود اور پروفیسر قاضی محمد اسلم ایسے غیر جانبدار اور صاحبانِ علم کی صائب آرا سے جذباتی نعرہ بازی کی گرد کو صاف کیا۔

''سوال یہ ہے'' اوراق'' کا ایک مستقل سلسلہ رہا ہے۔ اس سلسلے نے نئے مباحث کو جنم دیا اور مختلف مسائل پر مختلف آراء کو یکجا کر کے قاری کو سوچنے کی آزادی دی ہے۔ ''پہلا ورق'' میں اس سلسلہ کو اس وقت تک جاری رکھنے کا ذکر ملتا ہے، جب تک قارئینِ ادب اس میں اپنی شرکت محسوس کرتے رہیں گے، چنانچہ اب گزشتہ چند برسوں سے یہ سلسلہ ''اوراق'' میں نظر نہیں آ رہا، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اب بعض دوسرے جرائد تھوڑی سی ترمیم کر کے ''اوراق'' کے اس سلسلہ کی تقلید کر رہے ہیں۔

''اوراق'' نے اردو انشائیہ کے فروغ میں جو اہم کردار ادا کیا ہے، سب اس سے باخبر ہیں۔ ''پہلا ورق'' میں اردو انشائیہ کو خواہ مخواہ متنازعہ بنانے والوں سے علمی سطح پر بات کی گئی۔ ''جدید نظم''، ''جدید افسانہ''، ''تنقید''، ''سفر نامہ'' کی اصنافِ ادب کو بھی ''پہلا ورق'' میں نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔ ''نثری نظم'' کے معاملہ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے جو ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے، وہ خوش آئند ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس نئی صنف کو زبردستی شاعری کے زمرے میں شامل کرنے والے ادباء اس کے تخلیقی امکانات کی طرف توجہ کرتے اور اسے ادب کا ایک نیا اور موثر پیرایہ اظہار بناتے۔ بہر حال ''اوراق'' نے اس معاملہ میں اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

1973ء میں ''اوراق'' نے ادب میں اخباری طرزِ عمل پر اپنی ادارتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بجا طور پر تشویش کا اظہا کیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے بعض بزرگوں نے ادبی ماہناموں کا مسئلہ اٹھا کر ادبی پرچوں کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی اور اس طرح اخباری ادب کے فروغ کی صورت نکالی تو ''اوراق'' نے پہلا ورق میں نہایت مدلل اور مہذب طریقے سے ادبی پرچوں کو اہمیت کو واضح کیا اور ان ادبی ایڈیشنوں کے منفی طرز عمل کی نشان دہی کی جو ادب کو اخباری سطح پر لا رہے ہیں۔

''اوراق'' نے اپنے قیمتی صفحات میں بھی اور اپنے اداریوں میں بھی ادبی موضوعات کے علاوہ ان علمی موضوعات کو چھیڑا ہے جن کے ڈانڈے ادب سے ملتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بچوں کی ادبی تربیت اور مشرقیت کی شناخت سے لے کر مذہب، نفسیات، اساطیر، تاریخِ تہذیب، علم الانسان، علم الحیات، فلکیات اور جدید ترین سائنسی انکشافات تک کے موضوعات نہ صرف ''اوراق'' کے ادبی افق کو وسعت عطا کرتے ہیں، بلکہ اسے علمیت اور تخلیقیت سے بھی مملو کرتے ہیں۔ یوں ہم مشرقیت کا تشخص بھی جان لیتے ہیں اور زندگی اور کائنات کے پر اسرار تعلق کی کئی پرچھائیوں تک بھی رسائی حاصل کرتے ہیں۔

شروع میں ہی میں نے عرض کیا تھا کہ 'اوراق' کے یہ اداریے ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا اظہار ہیں۔ ان کے مزج کا دھیما پن 'پہلا ورق' کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔ تنقید میں ان کا انداز عموماً تمثیلی ہوتا ہے۔ چنانچہ 'پہلا ورق' کا اسلوب بھی تمثیلی ہے۔ انشائیہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی موضوع پر نئے زاویوں سے نظر تو ڈالی جاتی ہے، مگر اس میں مزید سوچ کی گنجائش بھی رہتی ہے۔ انشائیہ ایک صنف ادب ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا ایک رنگ بھی ہے اور اس رنگ کی چمک 'پہلا ورق' میں بھی نظر آتی ہے۔ آپ دیکھیں کہ ان اداریوں میں کسی بھی مسئلہ پر اپنی رائے دینے کے بعد اسے حتمی قرار نہیں دیا گیا بلکہ اپنے زاویۂ نظر کو اس طور بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کی سوچ کو مہمیز لگے۔ گویا یہ اداریے کہیں بھی مکمل مضمون نہیں بنتے بلکہ ایک مسئلہ اٹھا کر قارئین کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ادب میں سیاست کی طرح لیفٹ رائٹ کا جو سلسلہ

چل نکلا ہے، ڈاکٹر وزیر آغا نے کبھی بھی خود کو اس میں ملوث نہیں کیا اور دائیں، بائیں کی سیاست سے الگ ہو کر ہمیشہ تخلیقی سچائی کو اہمیت دی ہے۔ 'اوراق' کے اداریوں میں بھی یہی کہا جاتا رہا ہے کہ ادب خواہ سرخ پلیٹ میں پیش کیا جائے، خواہ سبز پلیٹ میں، اسے ادب ہونا چاہئے، پمفلٹ نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ایسے مخالفین بھی ہیں جو ان کے اداریوں کو اپنے اداریوں میں بے دھڑک نقل کر لیتے ہیں اور حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، لیکن کیا یہ 'اوراق' کے اداریوں کا کمال نہیں کہ وزیر آغا کے مخالفین بھی ان سے بلا حوالہ سہی اکتساب ضرور کرتے ہیں۔

'اوراق' کا پہلا دور 1966 میں شروع ہوا تھا، تب پاکستانی قوم 1965 کی جنگ کے بعد پوری طرح تحفظ ذات کے عمل میں مبتلا تھی۔ یوں ایک تخلیقی لمحہ روشن تھا۔ دوسرا دور 1972 میں شروع ہوا تھا، تب پاکستانی قومی 1971 کی جنگ میں شکست کے بعد احساس شکست سے دوچار تھی، لیکن تب بھی 'اوراق' نے احساسِ شکست کی عکاسی کرنے کی بجائے اس روشنی کو نمایاں کیا جو احساس شکست کے بطون سے لپک کر باہر آ رہی تھی۔ دونوں ادوار کے اولین اداریوں میں آپ یہ کہانی پڑھ سکتے ہیں۔

1966 میں شروع ہونے والا 'اوراق' 1970 میں کیوں بند ہو گیا تھا؟ پہلا ورق کے کسی ورق پر آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں ملے گا لیکن یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ 'پہلا ورق' کی ان کہی کہانی۔ آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ انسان کے نظریاتی چیمپئوں کے لئے 'اوراق' کی غیر جانبدار پالیسی ایک کھلا چیلنج تھی، چنانچہ نظریات کی آڑ لے کر ذاتیات میں تیسرے درجہ کی سطح پر اتر کر مخالفت کی گئی۔ مدیرانِ 'اوراق' کے لئے یہ پہلا اور حیران کن تجربہ تھا۔ انہوں نے اس پست ذہنیت کا اسی سطح پر اتر کر مقابلہ کرنے کے بجائے 'اوراق' بند کر دیا۔ 1972 میں اس کے دوسرے دور کا آغاز ہوا اور تب سے اب تک یہ عہد آفریں ادبی جریدہ پوری تابنا کی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اس کے اداریے تب سے اب تک کی ادبی رفتار کا ایک اشاریہ ہیں۔ 'اوراق' کے اداریوں کا یہ مجموعہ 'اوراق' کے مزاج کا ترجمان ہے۔ اگر اس میں آپ کو نظریاتی مباحث کا زہریلا

پن، اشتہارات کے لئے واویلا اور مہنگائی کے نام پر سرکولیشن میں اضافے کی فریادیں نظر نہ آئیں تو اسے بھی 'اوراق' کے مزاج کا حصہ سمجھیں۔ میں سمجھتا ہوں اب دوسرے بڑے جرائد کے اداریے بھی بلا کم و کاست کتابی صورت میں سامنے آنے چاہئیں۔ 'نیا دور' کے اداریے یقیناً اس قابل ہیں کہ انہیں کتابی صورت میں جلد پیش کر دیا جائے۔ تاہم یقیناً اور بھی اچھے ادبی جرائد ہوں گے، سو ان کے اداریے بھی کتابی صورت میں آنے کی اشد ضرورت ہے۔ تا کہ ان کے مزاج کا مجموعی تاثر بھی سامنے آسکے۔

اردو انشائیہ
اور اس کے بانی کی انشائیہ نگاری

اردو انشائیہ اس صدی کے دوسرے نصف کے آغاز کا قصہ ہے اور اب یہ کوئی دو چار برس کی بات نہیں رہی۔ 1950 سے اب تک ایک طرف انشائیہ کے خدو خال کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی تو دوسری طرف اس کے خدو خال مسخ کرنے کی 'سعیٔ نامشکور' کی گئی۔ ایک طرف اس کی کوئی تعریف متعین کرنے کی مخلص کاوش کی گئی تو دوسری طرف 'عقل سلیم' سے کام لئے بغیر اس کی تضحیک کی گئی۔ ایک طرف اردو ادب میں انشائیہ کی تاریخ مرتب کی گئی تو دوسری طرف انشائیہ کی بنیاد گرانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی ـــــ لیکن انشائیہ سخت جان صنف ادب نکلی پیروں، مریدوں، ڈاکٹروں، عطائیوں سب کی مخالفتیں دھری رہ گئیں اور انشائیہ کی کونپل ایک مضبوط پودا بن گئی۔ مخالفین جھلاہٹ کا شکار ہو گئے۔ پہلے صنفِ انشائیہ کی تضحیک کی جاتی تھی پھر تضحیک کرنے والے عطائی کالم نگار الیکٹرانک میڈیا پر اپنے کالم انشائیہ کے لیبل کے ساتھ پیش کرنے لگے۔ پہلے وزیر آغا کے مقابلے میں نام نہاد انشائیہ نگاروں کو اکلوتا انشائیہ نگار بنانے کی جدو جہد ہوتی رہی۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو اختر اورینوی کے ایک دیباچے کا سہارا لے کر علی اکبر قاصد کو انشائیہ کا بانی بنانے کی تگ و دو کی گئی ـــ مخالفین کا ہر نیا موقف خود ان کے پہلے موقف کی تردید کرتا گیا۔

جہاں تک اردو انشائیہ کی کوئی حتمی تعریف وضع کرنے کا تعلق ہے، صرف انشائیہ ہی نہیں کسی صنفِ ادب کی کوئی حتمی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود مختلف دوسری اصناف ادب جن کے بارے میں مختلف تعریفیں موجود ہیں اور ان میں تضاد ہونے کے باوجود ان اصناف ادب کو سمجھنے میں کوئی مغالطہ نہیں ہوتا، انشائیہ کی تعریف اور تفہیم کے معاملے میں مخالفین نے ہمیشہ 'تجاہل عارفانہ' سے کام لیا۔ مثلاً انشائیہ کی تفہیم کے لئے بار بار یہ سمجھا گیا کہ عادت اور تکرار کے دائرے سے باہر آ کر کسی چیز کو دیکھا جائے تو ایک نیا جہانِ معنی طلوع ہوگا۔ پھر اس رمز کو

سمجھانے کے لئے کبھی بتایا گیا کہ شہر کے کسی اونچے مینار سے شہر کو دیکھا جائے تو وہ اس شہر سے مختلف ہوگا جو ہم اب تک دیکھتے رہے ہیں۔ کبھی بتایا گیا کہ ایک کنارے سے دوسری طرف کا ایک ہی منظر دیکھنے کے بعد اگر آپ دوسرے کنارے کے طرف چلے جائیں تو وہاں سے آپ کو ایک مختلف اور نیا منظر دکھائی دے گا۔ کبھی بچپن کے ایک کھیل کی نسبت سے بتایا گیا کہ اگر آپ سمندر کو سامنے سے دیکھتے ہیں تو عام سی بات ہے لیکن اگر ٹانگوں میں سے سمندر کی طرف دیکھیں تو منظر کچھ اور طرح کا ہوگا۔ ان ساری مثالوں میں عادت اور تکرار کے دائرے سے باہر آنے کو ہی واضح کیا گیا، لیکن یار لوگوں نے انشائیہ کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھنا، مرغا بننا قرار دیا اور اس بات سے توبہ کی کہ وہ ایسے انشائیے لکھیں کہ جس میں مرغا بننا پڑے۔

ایسے مخالفین کے رویے پر مجھے وہ اندھا فقیر یاد آ گیا جس سے کسی نے پوچھا بابا کھیر کھاؤ گے؟ فقیر نے پوچھا وہ کیسی ہوتی ہے؟ جواب دیا گیا: دودھ جیسی سفید، پھر فقیر نے پوچھا: سفید رنگ کیسا ہوتا ہے، سمجھایا گیا، بگلے کی طرح، پھر پوچھا گیا: بگلا کیسا ہوتا ہے؟ مجبوراً ہاتھوں سے بگلے کا حدود اربعہ واضح کرنا پڑا اور اندھے فقیر نے ہاتھوں سے بگلے کی ساخت کو ٹٹول کر دیکھا اور توبہ توبہ کرنے لگا کہ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ میرے تو حلق میں پھنس جائے گی۔ سو لکیر کے فقیر، عقل کے اندھوں کے حلق میں انشائیہ کی ٹیڑھی کھیر تا حال پھنسی ہوئی ہے اور جب تک ٹانگوں میں سے سمندر دیکھنے کو بگلے کی ساخت کی طرح دیکھتے رہیں گے یہ ٹیڑھی کھیر ان کے حلق میں پھنسی رہے گی۔

وزیر آغا کے انشائیوں کے پہلے مجموعہ 'خیال پارے' کے مطالعہ کے بعد پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی کو نہ صرف انشائیہ کی روح کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی بلکہ وزیر آغا کے انشائیوں میں انہیں وہی رح کارفرما نظر آئی اور انہوں نے لکھا:

''انشائیہ نگاری کی بنیادی شرائط کو وزیر آغا نے 'خیال پارے' میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ موضوعات اور نگارش کو دونوں اعتبار سے ان کے یہاں انشائیہ کی روح ملتی ہے۔ وزیر آغا کے ان مضامین کو جوں جوں پڑھتے جایئے اَن جانی بوجھی اور روزانہ کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے

بارے میں احساس ہوگا کہ ہم انہیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ یا اس سے پہلے ہم نے انہیں اس زاویے سے کیوں نہ دیکھا۔ تازگی اور تازہ کاری کا یہ عنصر ان مضامین کا نمایاں وصف ہے۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی کو انشائیہ کی تفہیم میں کوئی الجھن پیش آئی نہ وزیر آغا کے انشائیوں سے لطف اندوز ہونے میں کوئی تعصب آڑے آیا۔

انشائیہ کی ٹیڑھی کھیر جن یاروں کے حلق میں پھنسی ہوئی ہے۔ انہیں اب وزیر آغا کے لئے انشائیہ کے بانی کے الفاظ بھی بڑی اذیت دیتے ہیں —— حالانکہ جب وزیر آغا کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ 'خیال پارے' شائع ہوا تھا تو مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا تھا:

''رفیقِ گرامی ڈاکٹر وزیر آغا چند دنوں سے ہمارے بعض بلند پایہ رسائل میں کچھ ایسے مضامین لکھ رہے تھے جنہیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت کچھ اس بچے کی سی ہو جاتی ہے جو اسکول میں دیر سے پہنچا ہو اور جس نے 'گھر کا کام' بھی نہ کیا ہو لیکن اس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کی بجائے ان میں برفی اور قلاقند کے دو بڑے بڑے لفافے تھما دیئے جائیں۔ میں کچھ عرصے تک ان کی اس شعبدہ بازی کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس یافتِ لطیف کو عام کیونکر کیا جائے۔ آخر ایک دن جب میں ان کا ایک پارۂ انشا —— غالباً 'لحاف' پڑھ کر اسی بچے کی سی کیفیت میں مبتلا تھا جس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں، یہ تجویز یک بیک میرے ذہن میں آئی کہ آغا صاحب کے ان بکھرے ہوئے پاروں کو جمع کر کے ادب اردو کی ایک جدید ترین صنف کے اظہارِ اولین کے طور پر اہل ذوق کی خدمت میں برملا پیش کر دیا جائے۔''

(تقدیم۔ 'خیال پارے')

جب مولانا صلاح الدین احمد نے وزیر آغا کے انشائیوں کو ادبِ اردو کی ایک جدید ترین صنف کا اظہارِ اولین قرار دیا۔ اس وقت انشائیہ کا کوئی نام نہاد بانی آگے نہیں بڑھا اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ جی یہ اس نئی صنف کا 'اظہار اولین' نہیں ہے، اس سے پہلے ہم اس صنف کی بنیاد رکھ چکے ہیں۔ اب ہر کوئی سہرا اپنے سر باندھنے پر تلا ہوا ہے۔

وزیر آغا کے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ 'چوری سے یاری تک' شائع ہوا تو مشتاق احمد یوسفی نے

لکھا:

''مضامین نو کا یہ مجموعہ اپنی تازگی اور توازن فکر و نظر کے لحاظ سے اردو ادب میں یادگار رہے گا......(اگر یہ کہا جائے کہ) وزیر آغا اردو میں اس صنف ادب (ایسے) کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی تو بے جا نہیں ہوگا۔''

مشتاق یوسفی نے وزیر آغا کو پہلا اور آخری انشائیہ نگار قرار دیا، میرے خیال میں زمانی لحاظ سے یقیناً وزیر آغا پہلے انشائیہ نگار ہیں اور کمال فن کے لحاظ سے آخری بھی۔ علامہ اقبال نے جب داغ کو جہاں آباد کا آخری شاعر کہا تھا تو زمانی لحاظ سے نہیں بلکہ کمالِ فن کے لحاظ سے کہا تھا۔

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

پس وزیر آغا پہلے انشائیہ نگار بھی ہیں اور کمالِ فن کے لحاظ سے آخری بھی، لیکن انہوں نے اس صنف کے ارتقا میں اپنی ذمہ داریوں سے کبھی پہلوتہی نہیں کی۔ خود انشائیے لکھ رہے ہیں۔ انشائیے کی تفہیم کے لئے مضامین لکھ چکے ہیں اور نوجوان انشائیہ نگاروں کو متعارف کرا رہے ہیں۔ یوں محض تین دہائیاں پہلے مولانا صلاح الدین احمد کی یہ تمنا اور دعا اب ایک حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔

''مصنف نے ادب کی اس نئی پگڈنڈی پر جو چراغ روشن کیا ہے اس کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں ہمارے نئے لکھنے والے اور آگے بڑھیں گے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنے اپنے چراغ رکھتے چلے جائیں گے۔ ادب کی نئی منزلیں یوں ہی دریافت ہوئی ہیں اور راتوں کو چلنے والے مسافر اسی طرح اپنے ٹھکانوں تک پہنچے ہیں۔ سلام ہے ان پر جو کسی بامراد سفر کا آغاز کرتے ہیں اور مبارک ہیں وہ لوگ جو مسلسل منزلوں کی جستجو میں اپنے ذوق طلب کو کبھی پژمردہ و فسردہ نہیں ہونے دیتے۔''

معترضین اور مخالفین کی تمام تر منفی کاوشوں کے باوجود موجودہ اردو انشائیہ کے بانی وزیر آغا ہی رہیں گے۔ انشائیہ کی صنف بھی پھلتی پھولتی رہے گی، اس کے وسیع تر امکانات کو اخباری کالموں کی

جملہ بازیوں اور تضحیک آمیز رویوں سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ خوشبو کو کون قید کر سکتا ہے؟ وزیر آغا کے ساتھی اولین انشائیہ نگاروں میں پہلے ایک عرصہ تک گنتی کے چند نام آتے رہے۔ غلام جیلانی اصغر، جمیل آذر، مشتاق قمر، انور سدید—— پھر جب ادیبوں کی نوجوان نسل نے اس صنف کو سمجھا اور اس کے وسیع امکانات کی طرف نظر ڈالی تو انشائیہ نگاروں کی ایک کہکشاں سی بنتی چلی گئی! اکبر حمیدی، انجم نیازی، سلیم آغا قزلباش، حامد برگی، محمد اسد اللہ، اقبال انجم، رعنا تقی، سعشہ خاں، فرح سعید رضوی، خالد پرویز، محمد اسلام تبسم، راجہ ریاض الرحمٰن، سلمان بٹ، خیر الدین انصاری، پروین طارق، مشتاق احمد اور ان کے علاوہ متعدد نئے لکھنے والوں نے کامیاب اور خوبصورت انشائیے تخلیق کئے۔ سینئر ادباء میں سے بھی متعدد ادبا نے صنفِ انشائیہ کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ ان کی انشائیہ نگاری پارٹ ٹائم ہے تاہم ان کے انشائیوں سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادبا انشائیہ کو سمجھتے بھی ہیں اور اسے لکھنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ ایسے سینئر ادباء میں جوگندر پال، غلام الثقلین نقوی، احمد جمال پاشا، محمد منشا یاد اور شہزاد احمد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ انشائیہ نگاروں کی یہ کہکشاں دم بدم بڑھتی جا رہی ہے۔ ماہنامہ 'چاند' میں چوری کی غزلیں چھپوانے والے کالم نگار یا کسی نفسیاتی مریض قسم کے ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں کہ انشائیہ کی خوشبو کو پھیلنے سے روک سکے۔

کر وہ زمانہ یاد کہ تھی آنکھ میں حیا
مابین دوستوں کے ابھی کچھ حجاب تھا

(وزیر آغا)

ہم تو خوشبو ہیں ہمارا راستہ روکے گا کون
کس بلندی تک وہ دیواریں اٹھا لے جائے گا

(اکبر حمیدی)

اردو انشائیہ کی تفہیم کے سلسلے میں اب تک مخالفت اور موافقت میں جو کچھ بھی لکھا جا چکا ہے، اس کا محاکمہ وزیر آغا کے مضمون 'اردو انشائیہ کی کہانی' میں کر دیا گیا ہے اور انشائیہ کی تمام تر بحث میں تا حال یہ مضمون حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

اردو انشائیہ کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے وزیر آغا نے اپنے مضمون 'اردو انشائیہ کی کہانی' میں لکھا ہے: ''میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی لطافت اور سفر نامے کا تحرک یکجا ہو گئے ہیں۔ تاہم انشائیہ محض ان اوصاف کی 'حاصل جمع' کا نام نہیں ہے، وہ ان سب کو اپنے اندر جذب کر کے خود ایک ایسی اکائی بن کر نمودار ہوتا ہے جس کی انفرادیت ان جملہ اوصاف کی حاصل جمع سے کچھ 'زیادہ' ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے انشائیہ کا ایک اپنا اسٹرکچر ہے، جو اسٹرکچرنگ (STRUCTURING) کے عمل کو بروئے کار لا کر سدا نئے نئے امکانات کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔''

میں اپنے اس مضمون کو وزیر آغا کے بعض انشائیوں اور دیگر اصناف میں ان کے فکری دھاروں کی مماثلت، ربط اور تعلق تک محدود رکھوں گا تاکہ انشائیہ میں دیگر اصناف کی 'حاصل جمع' اور پھر اس 'حاصل جمع سے کچھ 'زائد' کا منظر سامنے آ سکے۔

انشائیہ 'آگ تاپنا' میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

''شعلوں کی حرارت دھیرے دھیرے ہاتھوں سے ٹکراتی کسی گرم رو کی طرح میری رگ رگ میں اترتی چلی جاتی ہے تا آنکہ میرے سینے میں بھی ایک ننھی سی قندیل روشن ہو جاتی ہے۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے گویا میں نے آتش لرزاں سے اکتساب نور کر لیا ہے اور خود بھی اس جلتی اور تڑپتی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہوں۔ جیسے میری بے حس روح کا ہر تار، میرے منجمد جسم کا ہر عضو پگھل کر اس سیلِ آتشیں میں ضم ہو گیا ہے۔''

نظم 'دھوپ' میں شعلوں کی حرارت، دھوپ کی حرارت بن جاتی ہے۔

کہا میں نے ـــــ آ
اپنے برفاب گھر کے مقفل کواڑوں کو تو کھول کر
اس سمندر کو تک
جو خنک تیرگی کی سیہ باڑ کو پار کر کے
ترے گھر کی دہلیز تک آ گیا ہے!

...... ہاتھ اپنے ہلا کر اسے اپنی جانب بلا
اپنے خستہ بدن پر سے تو اپنی میت کا پتھر ہٹا
گھاس کو اذن دے وہ حسیں سبز قالین اپنا بچھائے
درختوں پہ گجرے نظر آئیں، طائر چہکنے لگیں۔
برف پگھلے،
غصیلی، سرافراز، بے رحم، ٹھنڈی ہوا اپنے گھر کو سدھارے
دکھی فرش سے ماوراعرش تک
دھوپ کا اک سمندر رہے موجزن

انشائیہ 'آگ تاپنا' میں وزیر آغا لکھتے ہیں۔

'میں دیکھتا ہوں ہوں کہ انگیٹھی کی بعض لکڑیاں بیک وقت دونوں اطراف سے جل رہی ہیں۔ یہ لکڑیاں ایک وقت میں روشنی کا بہت بڑا منبع کہلاتی ہیں لیکن بہت جلد ختم بھی ہو جاتی ہیں، ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو اپنی حیاتِ مختصر کو مٹھیاں بھر بھر کر لٹاتے ہیں اور مختصر سے عرصے میں کسی شہابِ ثاقب کی طرح جلتے دوڑتے ابدی تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں لیکن جن کی درخشندہ گزرگاہ افلاک کو بڑی دیر تک منور رکھتی ہے۔'

اب نظم 'انگیٹھی' کی چند لائنیں دیکھیں، نظم اور انشائیہ کے مضمون میں ہم آہنگی کے باوجود انشائیہ میں 'کچھ زائد' یا 'چیزے دیگر' صاف نظر آ رہی ہے:

بدن اس کا
ہزاروں سرخ پھولوں سے فروزاں تھا
تمازت اور خوشبو ـــــ دو جواں سکھیاں
اسے سرگوشیوں میں چھیڑتی تھیں ـــــ
ـــــ اور اب چاروں طرف
یخ بستگی ہے۔

بکھرتی راکھ نے سب سرخ پھولوں کو بجھایا ہے۔
تمازت اور خوشبو
دم بخود ہیں

انشائیہ 'چیخنا' میں وزیر آغا نے گاڑی کے انجن کی چیخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

'میں جب اس چیخ کو سنتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور نجانے کیوں مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ یقیناً ریل کی اس چیخ کا میرے بچپن سے کوئی گہرا تعلق ہے لیکن کیا تعلق، یہ بات میں نہیں جانتا۔'

ریل کی چیخ کا وزیر آغا کے بچپن سے جو گہرا تعلق ہے اس کا بھید ایک عرصہ کے بعد نظم 'ٹرمینس' میں آ کر کھلتا ہے۔

'چھنی کچھی کی بو سونگھ کر کالے انجن نے
فرطِ مسرت سے
اک چیخ ماری تھی
اور اس کی کالی جٹاؤں نے
پیچھے کی جانب کو اُڑ کر
گھسٹتی ہوئی ریل کے تن بدن کو چھوا تھا
دُھواں ریل کے پیٹ میں بھر گیا تھا
مگر پھر اچانک مجھے میرے بابا نے
پینک سے بیدار ہو کر کہا
لو سفر کٹ گیا
اب اٹھو
گاڑی رکنے کو ہے اپنی چیزیں سنبھالو
زمیں پر اتر کر، اسے دیکھ کر

اپنی حسرت نکالو

وزیر آغا کی نظموں اور انشائیوں میں ربط اور ہم آہنگی کے چند نمونے دیکھنے کے بعد اب بعض دوسری اصناف میں انشائیوں سے ربط اور ہم آہنگی کی چند مثالیں بھی دیکھتے ہیں۔

'اردو شاعری کا مزاج' میں وزیر آغا نے آریاؤں اور دراوڑوں کی آویزش کو تاریخ کے آئینے سے دکھایا ہے، اب اسی تاریخی حقیقت کو انشائیے کے آئینے میں دراڑوں کے موقف کے طور پر دیکھئے۔

'آریا جب ہم پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے قلعوں کو برباد کرتے چلے گئے تو جواباً اور انتقاماً ہم نے بھی ان کے مویشی چُرانے شروع کر دیئے۔ وہ سارا دن لڑنے بھڑنے کے بعد جب رات سمے آرام کرتے تو ہم شب خون مار کر ان کے مویشی اڑا لے جاتے۔ یقین جانو ہم نے انہیں اس قدر پریشان کیا کہ وہ اپنے اشلوکوں میں برکھا اور فرزند کے لئے دعائیں مانگنے کے بجائے ہمیں بد دعائیں دینا شروع ہو گئے۔'

(انشائیہ 'چوری سے یاری تک')

فکری سطح پر کائنات میں ثنویت کی کرشمہ سازی وزیر آغا کا پسندیدہ موضوع ہے اور وہ اس مسئلے پر کئی زاویوں سے لکھ چکے ہیں۔ خیر اور شر، زمین اور آسمان، روشنی اور تاریکی، زندگی اور موت، روح اور مادہ، یزداں اور اہرمن، ین اور یانگ، مرد اور عورت اور ان جوڑوں میں ایک عجیب اور حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے، کم و بیش ہر جوڑے میں ایک کردار کا مزاج مرد کی طرح ہے تو دوسرے کا مزاج عورت کی طرح —— مرد اور عورت کے حوالے سے ثنویت کی کرشمہ سازی وزیر آغا کے انشائیوں میں بھی جا بجا نظر آتی ہے۔

'سڑک نے مرد کی سی بے قراری اور سیمابیت پائی ہے...... فٹ پاتھ عورت کی طرح چنچل، ملائم اور سست گام ہے۔'

(انشائیہ 'فٹ پاتھ')

'تقسیم کا وصف عورت کی فطرت میں شامل ہے، جس طرح دھرتی ایک بیج کو سینکڑوں میں تقسیم

کر دیتی ہے اور درخت خود کو لاکھوں پتوں اور شاخوں میں بانٹ دیتا ہے، بعینہ عورت ازل سے اپنے گھر کو کوٹھڑیوں اور سامان کو پوٹلیوں میں تقسیم کرتی آئی ہے۔'

(انشائیہ 'سیاح')

بحیثیت نقاد وزیر آغا کے ناقدانہ خیالات بھی ان کے انشائیوں میں جذب ہو گئے ہیں۔ نثری نظم کے بارے میں وزیر آغا کا موقف ایک کھلی حقیقت ہے۔ ایک انشائیے میں اس کا ذکر دیکھیں۔

'بہادری ایک ناتراشیدہ جذبہ ہے جو سطحیت میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کے پس منظر میں کسی ذہنی ارتقا کے نقوش نہیں ملتے۔ اس کے برعکس بزدلی انسان کے تدریجی، ذہنی اور سماجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ نثری نظم کے طرح بزدلی بھی مستقبل کی چیز ہے۔'

(انشائیہ 'بہادری')

انشائیہ 'غزل' میں قصیدے کی پسلی سے غزل کی پیدائش کی کہانی آدم کی پسلی سے حوا کی پیدائش کے مذہبی تصور کی طرف واضح اشارہ ہے۔

شاعری، تاریخ، فلسفہ مذہب، تنقید، کہانی ــــــ وزیر آغا کے انشائیے ان سب کی حاصل جمع ہی نہیں بلکہ ان میں کچھ 'زائد' کا منظر دور سے ہی چمکتا ہوا نظر آجاتا ہے۔ تاہم وزیر آغا کے انشائیے اس لحاظ سے 'پرسنل ایسے' بھی ہیں کہ ان میں ان کی شخصیت، ان کے خیالات، ان کا مزاج دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ بلکہ ان کا مزاج جسے انشائی مزاج کہنا چاہیے، ان کی تنقید کے اسلوب پر بھی چھا گیا اور ان کی دیگر تخلیقات میں بھی یہی انشائی مزاج کارفرما نظر آتا ہے۔

وزیر آغا کے انشائی مزاج کے بارے میں مشتاق احمد یوسفی نے ایک اچٹتا سا اشارہ کیا تھا:

'سخت سے سخت بات کو نرم انداز میں کہنے کا یہ طرز کم کم ادیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ لڑتے ہیں مگر اس سادگی سے کہ اپنی تلوار کو بے نیام نہیں ہونے دیتے۔ مزاح ان کے لئے سیف نہیں، سپر ہے۔'

زہریلے طنز نگار اور لٹھ بردار مصلحین ادب اسی لئے انشائیہ لکھنے پر قادر نہیں ہو سکے کہ ان کا مزاج غیر انشائی ہے۔ انشائیہ لکھنے کے لئے جس صوفیانہ رواداری اور بے نیازی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے نصیب میں نہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد نے 'خیال پارے' کی اشاعت کے وقت جب اردو میں انشائیہ کی نئی صنف کا خیر مقدم کرتے ہوئے چراغ سے چراغ جلتے چلے جانے کی تمنا کی تھی تب وزیر آغا کو بھی گمان نہ تھا کہ اگلے تیس برسوں میں ہی یہ صنف اپنی جڑیں مضبوط کر لے گی اور اب کہ چاروں طرف مخالفت کی شدید آندھیاں چل رہی ہیں جو اس نئی صنفِ ادب کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ وزیر آغا پورے وثوق سے کہہ رہے ہیں:

'ہمارے ہاں بعض اصناف ادب پر دیگر فنون کا غلبہ صاف محسوس ہو رہا ہے مثلاً شاعری پر موسیقی کا اور کہانی پر فلم کا، لیکن انشائیہ وہ واحد صنف ہے جو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں اختصار کا دامن وسیع ہے اور خود اس کے اندر امکانات کا یہ عالم ہے کہ اسے کسی اور فن لطیف کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی صدیوں میں انشائیہ وہ واحد صنف نثر ہے جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے باعث کامیاب ہوگی اور اپنی ہیئت اور مواد دونوں میں ایجاز واختصار کو ملحوظ رکھنے کے باعث آنے والے زمانوں کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے میں کامیاب ہوگی۔' **('اردو انشائیہ کی کہانی')**

وزیر آغا کا یہ دعویٰ اور یہ یقین دراصل اعتماد کا اظہار ہے، مخالفت کے باوجود اردو انشائیہ کی حوصلہ افزا صورت حال پر بھی اور اپنی انشائیہ نگاری پر بھی۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہی انشائیہ کے خلاف اڑائی گئی گرد کو ختم ہوتے دیکھ سکوں گا۔ تب اردو انشائیہ کے فروغ کے لئے وزیر آغا کی خدمات اور ان کی انشائیہ نگاری کو صاف اور اجلے تناظر میں زیادہ بہتر طور پر دیکھا جا سکے گا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر وزیر آغا نے جب اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ایک نووارد ادیب کی حیثیت سے وہ اس تحریک کے مثبت پہلوؤں سے متاثر بھی ہوئے اور وہ اثرات ان کی ابتدائی نگارشات میں نظر بھی آتے ہیں۔ مثلاً ان کی پہلی نظم 'دھرتی کی آواز' اور نظم 'ننھے مزدور' میں طبقاتی امتیاز اور کشمکش کو ظاہر کیا گیا ہے، اسی طرح ان کی پہلی کتاب 'مسرت کی تلاش' میں بھی ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا:

'دولت کی ناروا تقسیم نے انسان کو طبقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے اور یوں جنگ، قحط، بادشاہت اور سرمایہ داری کو معرض وجود میں لا کر فرد اور سماج کو ایک ایسی غلط روش پر گامزن کر دیا ہے کہ آج انسان اس کے خلاف پورے عزم اور شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔'

لیکن ترقی پسند تحریک زندگی کی ایک قاش کا صرف ایک ہی رخ دیکھنے پر مُصر تھی جبکہ وزیر آغا پوری زندگی کے بھید کو سمجھنے کی جستجو میں تھے۔ اس لئے ان کے لئے محض خارجی عوامل کی بنیادوں پر لکھتے چلے جانا ممکن نہ تھا اور وہ پوری زندگی کے اسرار کو سمجھنے کی دھن میں مگن ہو گئے۔ ان کی تخلیقات کی طرح ان کی تنقید بھی اسی جستجو سے عبارت ہے۔

وزیر آغا شروع میں نصیر آغا کے قلمی نام سے 'ادبی دنیا' میں مضامین لکھتے رہے۔ 'محبت کا تدریجی ارتقا' ان کا پہلا مضمون تھا جو ان کے نام کے ساتھ شائع ہوا۔ 1954 میں ان کی پہلی کتاب 'مسرت کی تلاش' شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ساتھ وزیر آغا کے ہاں دو فکری تجسس نمایاں ہوئے۔ ایک زندگی کو اس کی 'کلیت' (TOTALITY) میں دیکھنے کی خواہش دوسرا مسرت کی ماہیت کی تلاش اور جستجو۔ یہی دو تجسس آگے چل کر پھیلاؤ کی صورت اختیار کر گئے۔ مسرت کی

ماہیت کی تلاش میں انہوں نے 'اردو ادب میں طنز و مزاح' لکھی۔ اس کتاب کو لکھتے وقت وزیر آغا انسان کے دو طبعی رجحانات سے آشنا ہوئے۔ ایک تشدد اور دفاع کا اور دوسرا پھیلاؤ اور آفاقیت کا۔ آرتھر کوئسلر کے خیال میں ہنسی اور طنز پہلے رجحان کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں جب کہ 'المیہ' دوسرے رجحان میں سامنے آتا ہے۔ یہ دراصل 'عام طنز و مزاح' اور 'تخلیقی فن پارے' کا بنیادی فرق ہے۔ وزیر آغا نے 'عام طنز و مزاح' سے ہٹ کر انشائیہ نگاری شروع کی اور نمائش دنداں کے مقابلے میں زیر لب تبسم اور داخلی شگفتگی و تازگی پر زور دیا تاکہ جذبے کا اخراج نہ ہو بلکہ مسرت ہماری رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ تخلیقی سطح پر اب گویا مسرت کی ماہیت کی تلاش اور پوری زندگی کی جستجو کے سفر ایک ہو گئے تھے۔

'نظم جدید کی کروٹیں' کے مضامین میں ڈاکٹر وزیر آغا نے مختلف شعرا کی اصل بنیادیں دریافت کیں۔ فیض کے بارے میں وزیر آغا کا مضمون 'انجماد کی ایک مثال' خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہوا اور ترقی پسندوں کی طرف سے نظریاتی بنیادوں پر (ادبی بنیادوں پر نہیں) اس کی مخالفت کی گئی۔ تاہم اس کتاب کا سب سے اہم اور سب سے زیادہ مشہور ہونے والا مضمون میراجی کے بارے میں تھا۔ 'دھرتی پوجا کی ایک مثال۔ میراجی۔' اس مضمون کو سنجیدہ ادبی حلقوں نے سراہا جبکہ مخالفین نے وزیر آغا کی اصطلاح 'دھرتی پوجا' کو بطور الزام وزیر آغا کے ماتھے پر سجا دیا۔ انہیں دھرتی پوجا کی تبلیغ کا مجرم قرار دیا گیا۔ قطع نظر اس سے کہ مخالفین کے الزام کا تجزیہ کیا جائے تو وزیر آغا 'ارض وطن' سے محبت کے مجرم ہی قرار پاتے ہیں، اس مضمون کی اصل اہمیت یہ تھی کہ وزیر آغا کا فکری سفر صاف آگے کو بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی تک ان کا ادبی تصور یہ تھا کہ جس طرح مجسمہ ساز پتھر سے مجسمہ نہیں تراشتا بلکہ پتھر سے فاضل مواد کو ہٹا کر اس میں موجود تخلیق کو آشکار کرتا ہے۔ اسی طرح ادیب بھی دو چیزوں کے بُعد میں نیا ربط تلاش کرتا ہے۔ یہ زندگی میں کلیت دیکھنے کی ہی ایک صورت تھی، لیکن میراجی کے بارہ میں اپنے مضمون میں وزیر آغا نے ثنویت کے انوکھے تصور سے آگاہی حاصل کی۔

ایک حدیث قدسی ہے! ''میں ایک مخفی خزانہ تھا سو میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں'' نور کے

مقابلے میں اگر تاریکی نہ ہوتو نور کی پہچان ممکن نہیں۔ یزداں اور اہرمن، ین اور یانگ، پرش اور پرکرتی، آدم اور حوا ـــــ ان سب کے باہمی ربط اور اختلاف سے زندگی کی ایک نئی صورت ابھری۔ ثنویت کا یہ تصور وزیر آغا کی شہرہ آفاق تصنیف 'اردو شاعری کا مزاج' میں زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آیا، گویا کائنات میں یکسر یکتائی کا عالم نہیں بلکہ ہر پارٹیکل کا اینٹی پارٹیکل موجود ہے اور دونوں کی بقا کا انحصار ایک دوسرے کے وجود پر ہے۔

'اردو شاعری کا مزاج' کا بنیادی نظریہ ہیگل کی جدلیات، THESIS' اور ANTITHESIS کے تصادم اور ملاپ سے SYNTHESIS کے وجود میں آنے کے نظریے پر قائم تھا۔ مارکس نے معاشی، سماجی اور سیاسی حوالے سے اسے اپنایا مگر وزیر آغا نے اسے ادبی اور ثقافتی تناظر میں منطبق کیا۔ ہیگل نے ثنویت کے دونوں پہلوؤں کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ دونوں کو ایک دوسرے کا حریف قرار دینے کی بجائے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کا درجہ دیا۔ یہ بہت بڑی حقیقت تھی مگر اس سے مروجہ اخلاقیات کو شدید دھچکا پہنچا اور مذہبی دنیا میں ایک کہرام برپا ہوا۔ ثنویت کی دونوں متضاد حقیقتیں ٹکراتی ہیں اور ان میں ملاپ بھی ہوتا ہے اور پھر دونوں کے مضبوط اجزا مل کر ایک تیسری صورت (SYNTHESIS) اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا ہر SYNTHESIS ایک نئی ثنویت کا آغاز ہے۔ وزیر آغا نے اسی بنیاد پر 'اردو شاعری کا مزاج' میں برصغیر کی ثقافتی اور ادبی تاریخ کا جائزہ لیا۔ آریائی اور دراوڑی تہذیبوں کے تصادم اور ملاپ سے 'ہندی آریائی' تہذیب نے جنم لیا اور گیت کی ادبی صنف کو فروغ ملا۔ مسلمانوں کی آمد سے مسلم ہندی تہذیب مرتب ہونے لگی اور غزل کی ادبی صنف کو فروغ ملا اور پھر جب انگریزوں نے یہاں کا نظام حکومت سنبھالا تو نظم کی صنف ابھر کر سامنے آئی (مغربی تہذیب اور ہماری تہذیب کا ٹکراؤ تو شاید ابھی بھی جاری ہے)۔

وزیر آغا نے صرف ہیگل کے نظام فکر کو ادبی اور ثقافتی سطح پر منطبق کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس سے آگے کا سفر بھی کیا۔ 'اردو شاعری کا مزاج' میں ہیگل کے DIALECTICS سے ہٹ کر دو نئے اور اہم نکات سامنے آئے۔ ایک یہ کہ عناصر کے ٹکراؤ اور ملاپ کے بعد SYNTHESIS کے وجود میں آنے سے پہلے 'کچھ عرصہ کے لئے پیچھے ہٹنے کا عمل' ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ پیچھے ہٹنے کی حالت

میں ایک 'جست' وجود میں آتی ہے۔ جیسے جمپ لگانے والا پہلے تھوڑا سا پیچھے کو ہٹتا ہے اور پھر آگے کی طرف جمپ لگاتا ہے۔ 'پیچھے ہٹنے اور پھر جست بھرنے' کے اہم نکات نے آگے چل کر وزیر آغا کے تنقیدی نظام فکر میں اہم کردار ادا کیا۔

'اردو شاعری کا مزاج' کے بعد وزیر آغا کے متفرق مضامین جرائد میں چھپتے رہے۔ یہ مضامین مختلف مجموعوں میں یکجا کئے گئے۔ ان مجموعوں میں 'تنقید اور احتساب' 'نئے مقالات'، 'تنقید اور مجلسی تنقید'، 'نئے تناظر'، 'دائرے اور لکیریں' اور 'انشائیہ کے خدوخال' شامل ہیں۔ تنقیدی مضامین کے ان مجموعوں میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے اب تک کے ادبی موقف کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور عملی تنقید کے عمدہ نمونے پیش کئے۔

'انشائیہ کے خدوخال' کے مضامین طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں انشائیہ کی صنف کے خدوخال کو نمایاں کرنے اور ان کی تفہیم کے لئے قابل قدر کوشش کی گئی ہے۔ اس مجموعے کا ایک مضمون 'اردو انشائیہ کی کہانی' ایک اعلیٰ درجے کا مضمون ہے۔ اس میں انشائیہ کے خلاف محاذ کھولنے کے اصل پس منظر، مخالفین کی اصل حقیقت اور انشائیہ کی قابل قدر پیش رفت کو مربوط اور مدلل طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو اگر انشائیہ کی بوطیقا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

متفرق مضامین کے مجموعوں سے ہٹ کر 'اردو شاعری کا مزاج' کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب 'تخلیقی عمل' بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انہوں نے یہ موقف پیش کیا کہ مخالف عناصر کے متصادم ہونے سے پہلے انجماد یا خلا پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے مخالف عنصر اس کی طرف لپکتا ہے۔ اس کی مثال ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول ایسے ہی ہے جیسے ہوا کا دباؤ کم ہو جائے تو باہر سے ہوائیں امڈ آتی ہیں۔ اس کے بعد دونوں عناصر میں ٹکراؤ اور ملاپ کی صورت بنتی ہے۔ وزیر آغا اس جست کی مثال یوں دیتے ہیں کہ جیسے کائنات 'عدم' کے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔ گویا وزیر آغا کے نزدیک ایسے تخلیقی عمل سے گزر کر آنے والی تخلیق نہ تو ایسی موجود حقیقت ہے جسے فنکار نے محض دریافت کیا ہے اور نہ ہی وہ مختلف چیزوں کا آمیزہ ہے بلکہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔

اپنے موقف کی وضاحت میں وزیر آغا نے مذہبی روایات، اساطیر اور کوزہ گروں کے تخلیقی عمل

تک کا گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور بڑی محنت سے انہیں اپنے موقف پر منطبق کر دکھایا ہے۔
'تخلیقی عمل' کے اپنے موقف کو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب 'تصورات عشق وخرد' میں زیادہ وسعت کے ساتھ ثابت کیا ہے۔شاید اسی لئے اقبالیات پر لکھی گئی بے شمار ایک جیسی کتابوں کے ہجوم میں یہ کتاب الگ سے پہچانی جاتی ہے۔اس کتاب میں وزیر آغا نے مخالف قوتوں کے ٹکراؤ کے بعد پیدا ہونے والی 'بے ہیئتی' کو مزید واضح کیا ہے۔تخلیقی عمل میں 'بے ہیئتی' کی حالت کی مثال اس شخص سے دی گئی تھی جسے کسی اندھے کنویں میں بند کر دیا جائے اور وہ روشنی کی جھلک پانے کے لئے بے چین ہو۔جیسے ہی اسے کنویں سے رہائی ملے اور دور سے روشنی نظر آئے وہ دیوانہ وار اس روشنی کی طرف جائے گا ــــ 'تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں' اس تمثیل کو زیادہ بامعنی اور واضح کر دیتی ہے۔حضرت یوسفؑ کو حضرت یعقوبؑ کی بینائی کا درجہ حاصل ہے۔حضرت یوسفؑ کا اندھے کنویں کی قید سے باہر آنا دراصل حضرت یعقوبؑ کی بینائی کا واپس آنا ہے۔وزیر آغا کے بقول تخلیقی عمل کے دوران ہر تخلیق کار کو 'بینائی' حاصل ہوتی ہے۔یہ 'بینائی' وہ جست ہے جو بے ہیئتی سے نکلنے کا ذریعہ بھی ہے اور اس کا ثمرہ بھی!

'تصورات عشق وخرد' کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا کی قابل ذکر تنقیدی کتاب 'تنقید اور جدید اردو تنقید' ہے۔اس کتاب کے پہلے حصے میں مغربی تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساختیات و مابعد ساختیات جیسے تازہ ترین موضوعات پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اردو تنقید کا جائزہ لیا گیا ہے۔محمد حسن، خلیل الرحمٰن اعظمی اور محمد علی صدیقی تک ناقدینِ اردو کا ذکر کیا گیا ہے۔

اردو تنقید ایک عرصہ تک مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، عمرانی تنقید، ادبی تنقید وجودی تنقید کے خانوں میں تقسیم رہی ہے۔اب اس میں ساختیاتی اور پس ساختیات تنقید کا اضافہ بھی ہو چکا ہے۔ اس طرح کسی ایک نظریے کی عینک پہن کر فن پارے کو دیکھا جاتا ہے جو فن پارہ اپنے پسندیدہ نظریے سے ہم آہنگ ہوا سے عظیم قرار دے دیا جاتا ہے اور جو فن پارہ اپنے نظریے کے مطابق نہ ہوا سے مسترد کر دیا جاتا ہے۔تنقید کے مختلف دبستان دراصل دریا سے نکالی گئی نہریں ہیں۔ان کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن یہ بہت محدود ہو جاتے ہیں۔وزیر آغا نے یک رخی تنقید کے مقابلے میں

امتزاجی تنقید کا رستہ اختیار کیا ہے۔یوں وہ اپنی الگ نہر نکالنے کی بجائے تمام دریاؤں کو سمندر میں گرنے دیتے ہیں 'تنقید اور جدید اردو تنقید' میں امتزاجی تنقید کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

آخر میں مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک ادھوری کتاب کا ذکر کرنا ہے۔''آشوب آگہی'' سلسلے کے چند مضامین ''اوراق'' میں شائع ہوئے تھے اور انہیں بے حد پسند کیا گیا تھا۔تاحال وزیر آغا نے اپنی یہ ادھوری کتاب مکمل نہیں کی مگر اسی تسلسل میں انہوں نے ''اوراق'' کا ایک اداریہ لکھا اور ایک مضمون ایک ادبی تنظیم کی تقریب میں پڑھا (یہ مضمون بھی بعد میں اوراق کے اداریہ میں شامل کر لیا گیا) میں اسی مضمون کا ایک حصہ ''آشوب آگہی'' کے تسلسل میں پیش کرنا چاہتا ہوں:

''مسکراہٹ ہمیشہ منفی نوعیت کی کھسیانی مسکراہٹ نہیں ہوتی اس کا ایک روپ وہ معنی خیز مسکراہٹ بھی ہے جو مونا لیزا کے لبوں پر نمودار ہو تو اپنی تخلیقی صلاحیت کے احساس سے منور ہو جائے اور گوتم کے ہونٹوں پر آئے تو پہچان اور عرفان سے عبارت دکھائی دے۔ ہرمن ہیسے نے گوبند کے لمحۂ انکشاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ایک روز اپنے دوست سدھیارتھ کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے تھا کہ یکایک اس نے دوست کے چہرے میں سینکڑوں چہروں کو گذرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ گذرنے کے باوجود گذر نہیں رہے تھے۔اس نے مچھلی کا کھلا ہوا منہ دیکھا اور پھر مچھلی کو مرتے ہوئے دیکھا۔اس نے ایک نوزائیدہ بچے کا چہرہ دیکھا جس پر لاتعداد جھریاں تھیں پھر اس نے ایک قاتل کو دیکھا جو کسی کے پیٹ میں چھرا گھونپ رہا تھا۔

اسی لمحے اس نے قاتل کو پابجولاں حالت میں اس طور دیکھا کہ جلاّد اس کا سر قلم کر رہا تھا۔اس نے ایسی لاتعداد صورتوں کا نظارہ کیا جو ایک دوسری کے ساتھ محبت اور نفرت کے لاکھوں رشتوں میں منسلک تھیں۔ وہ بیک وقت ایک دوسری کو ختم بھی کر رہی تھیں اور اپنی ہی راکھ سے دوبارہ جنم بھی لے رہی تھیں یہ تمام صورتیں رُکتی تھیں، چلتی تھیں کھلتی اور مرجھاتی تھیں۔ایک دوسری میں ضم ہوتی تھیں اور ان سب پر شیشے کا ایک لطیف اور مہین سا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ یہ غلاف دراصل سدھیارتھ کی ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔مسکراہٹ جو جاننے اور پہچاننے کے عمل سے پیدا ہوئی تھی۔بس یہ مسکراہٹ ہی زندگی کا حاصل ہے لیکن یہ مسکراہٹ صرف اس وقت جنم لیتی ہے جب

انسان ''دیکھنے'' پر قادر ہو جاتا ہے''۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری کو اگر ان کے فکری ارتقاء کے تسلسل میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جس نوجوان نے اس صدی کی پانچویں دہائی میں مسرت کی تلاش شروع کی تھی چار دہائیوں کے اپنے فکری سفر میں اس نے اسے تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ یہ مسرت جو جاننے اور پہچاننے کے عمل سے پیدا ہوتی ہے ڈاکٹر وزیر آغا کا نصیب ہے کیونکہ بلاشبہ وہ ''دیکھنے'' پر قادر ہیں۔

کل اور جزو کا فرق۔۔کل میں جزو اور جزو میں کل کا منظر۔کل کے روبرو جز کا اپنا تشخص برقرار رکھنا۔ یہ سارے مراحل زندگی کو سمجھنے کی وزیر آغا کی کوشش تھے اس عہد میں جب کہ ساختیاتی فکر نے ساختیہ کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے اور دوسری طرف طبعیات میں QUARKS کی دریافت کے ساتھ ایٹم کے پارٹیکلز کی ماہیئت کے بارے میں نئے سرے سے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وزیر آغا کو گویا اپنے تصورات کو اپنے ہی سوالات کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر سمجھنے اور سمجھانے کا موقعہ مل گیا ہے۔

ساختیاتی فکر کے حوالے سے اور اردو تنقید کے وسیلے سے ڈاکٹر وزیر آغا کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے ساختیاتی دانشوروں کی طرح مغربی لکیر کی فقیری نہیں کی اور اس کی دانشورانہ چکا چوند سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے اور اس کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کے اس عیب کو بھی واضح کیا ہے کہ اس ڈسپلن نے تخلیق کار کو یکسر نظر انداز کر کے انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ ساختیاتی فکر سے مناسب حد تک استفادہ کے باوجود وزیر آغا مصنف، تصنیف اور قاری کے رشتوں میں توازن قائم کرتے ہیں۔

جدید اردو تنقید ایک عرصہ تک وزیر آغا کی فکر اور تنقید سے رہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک مطالعہ

ہمارے ادب کا یہ المیہ رہا ہے کہ یہاں ادیبوں کی زندگی میں ان پر نہ ہونے کے برابر کام ہوتا ہے اور موت کے ساتھ ہی ان کی خوبیوں کی تلاش اور شمار کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ چند خوش قسمت ادیب ایسے ضرور ہیں جن کی زندگی میں ہی انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا، تاہم ان چند میں سے بھی بیشتر کو جو تحسین فراواں نصیب ہوئی اس میں تخلیقی کارنامے کم اور سیاسی وفاداری کے کمالات زیادہ مدنظر رکھے گئے۔

ڈاکٹر انور سدید مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا ایسی عہد آفریں ادبی شخصیت کی زندگی میں ہی ان کے بارے میں ایک پر مغز کتاب لکھ دی اور مشفق خواجہ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ادب کے ایک غیر جانبدار اور سنجیدہ قاری کی حیثیت سے اس کتاب کی اشاعت کا انتظام کر کے تخلیقی صداقتوں کا کسی سیاسی پس منظر اور مصلحت کے بغیر احترام کیا اور اس سچائی کو ادب کے دوسرے قارئین کے سامنے پیش کیا۔

ڈاکٹر انور سدید کی وزیر آغا سے عقیدت اور محبت کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، لیکن یہ ساری عقیدت اور محبت بھی تخلیقی سچائی کی روشنی سے پھوٹی ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا سے اپنی محبت اور عقیدت کا جواز ان لفظوں میں فراہم کیا ہے:

''وزیر آغا نے میرے دل میں ادب کی بجھی ہوئی قندیل کو دوبارہ روشن کیا۔ نیز ادب کو حصول مقاصد کا وسیلہ بنانے کے بجائے مجھے اس کے لئے خون دل جلانے کا ذوق وشوق عطا کیا۔ انہوں نے مجھے اس کوہ کنی کا عادی بنایا جس کا حاصل نہ 'شیریں' ہے اور نہ 'جوئے شیر' بلکہ جس کا ثمر نکتہ آفرینی کی وہ لذت حیات آفریں ہے جس سے روح سبکسار ہو جاتی ہے اور بدن کا تمام زنگ اتر

جاتا ہے۔''

انورسدید نے وزیر آغا سے ادب کی جو روشنی حاصل کی اس کا نتیجہ ہے کہ وزیر آغا سے تمام تر موانست کے باوجود انہوں نے کہیں بھی بلا دلیل بات نہیں کی۔ ان کی اس خوبی کا مشفق خواجہ نے ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے:

''بلا شبہ یہ کتاب ایک عقیدت مند نے لکھی ہے لیکن انورسدید نے صرف عقیدت ہی کو معیار نہیں بنایا۔ انہوں نے دلائل کے ساتھ اور ایک صاحبِ نظر مبصر کی حیثیت سے وزیر آغا کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ انہوں نے ہمارے ادب کو کیا کچھ دیا۔''

سات فصلوں پر مشتمل یہ ضخیم کتاب براہِ راست وزیر آغا کی شخصیت کو نہیں ابھارتی بلکہ ان کی تخلیقات کا اس انداز سے مطالعہ پیش کرتی ہے کہ تخلیقات کے بطون سے تخلیق کار کی ہفت رنگ دلآویز شخصیت خود بخود ابھر آتی ہے۔ سچی تخلیق کا کمال یہی ہوتا ہے کہ اس کا تخلیق کار اس میں خود سانس لے رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس محض نظریہ بردار ادیب جو نظریات کے جبر سے ہانپتے کانپتے تخلیق کا ڈھول پیٹتے ہیں، ان کی تخلیقات میں ان کی ذات کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر انورسدید جدید نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جدید نظم نے معنی کا معنی تلاش کرنے کے لئے بالعموم لفظ کو منزل قرار نہیں دیا بلکہ اسے محض وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لفظ کا معنوی دائرہ محدود رہنے کے بجائے وسیع ہو گیا اور تجربے کو الفاظ میں متحجر کرنے کے بجائے اس کو فطری سیال کیفیت میں پیش کرنا ممکن ہو گیا۔''

اس کے بعد انورسدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کی متعدد نظموں کے حوالے دے کر ان میں تجربے کو اس کی فطری سیال کیفیت میں دکھایا ہے۔ ساری کتاب ایسی دلیلوں سے بھری پڑی ہے۔ وزیر آغا کی شاعری کے مختلف امیجز ہوا، شام، رات، صبح، دھوپ، سورج، روشنی، شہر، ماں، جنگل، شجر، دھرتی اور برکھا وغیرہ کو انورسدید نے ان کی پوری معنویتوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔

وزیر آغا کی تنقید کے ضمن میں انورسدید نے ان کے نظامِ تنقید کو یوں بیان کیا ہے:

''ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں تنقید کا جو نظام مرتب ہوتا ہے، اس نے کسی ایک سرچشمۂ علم سے

استفادہ نہیں کیا بلکہ یہ سب علوم کو روشنی کے ماخذ تصور کرتا ہے اور انہیں یکساں آزادی کے ساتھ مزید روشنی پھیلانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔''

ان کے تنقیدی نتائج کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ نتیجے کو زورِ بازو سے ثابت کرنے کی بجائے اس کی کرنوں کو ہر چہار جانب بکھیرتے چلے جاتے ہیں اور ان کرنوں سے ہی قاری کو مرکزی نقطے کی طرف پیش قدمی کا راستہ دکھاتے ہیں۔''

انورسدید نے وزیر آغا کی جملہ تنقیدی کتب کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے، 'اردو شاعری کا مزاج' جیسی تہلکہ خیز کتاب کی اہمیت واضح کی ہے۔ 'نظم جدید کی کروٹیں'، 'تنقید اور احتساب'، 'تنقید اور مجلسی تنقید'، 'تصوراتِ عشق و خرد' وغیرہ کتب سے لے کر ان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ 'اردو ادب میں طنز و مزاح' تک تمام کتب کا جائزہ پیش کیا ہے۔

وزیر آغا پر عائد کئے جانے والے دھرتی پوجا کے الزام کو متعدد مقامات پر مضبوط دلائل سے رد کیا ہے، لیکن اس الزام کی تردید اور وزیر آغا کے موقف کی وضاحت اور صداقت میں یہ دلیل پہلی بار سامنے آئی ہے کہ وزیر آغا کی اپنی دھرتی سبز رنگ کی ہے۔ اس سبز رنگت میں کسی سرکاری نظریہ برداری کے طور پر نہیں بلکہ ان کی اپنی ایمانیات کا حصہ ہوتے ہوئے ان کی پاکستانیت نمایاں ہے۔

'آدمی صدی کے بعد' کے مطالعہ میں انورسدید نے ارضِ پاک سے وزیر آغا کی گہری محبت کو یوں تلاش کیا ہے:

''وزیر آغا کی اس نظم میں سبز رنگ جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے۔ سبز رنگ دھرتی کی تخلیقی صلاحیت کا استعارہ ہے۔ یہ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو طراوت بہم پہنچاتا ہے۔ دھرتی کے حوالے سے یہ ارضِ پاکستان اور اس کے پرچم کی علامت ہے۔ وزیر آغا نے اس رنگ کو بار بار اپنے اوپر نچھاور کر کے ارضِ وطن سے گہری وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب 'تخلیقی عمل' اپنی جگہ اہمیت کی حامل کتاب ہے، لیکن انورسدید کے مطالعہ نے اس کے بعض مخفی گوشے اجاگر کر کے اس کی زبردست اہمیت واضح کر دی ہے۔ 'تخلیقی عمل' 1970 میں شائع ہوئی تھی اور وزیر آغا نے اس میں جست کی کارکردگی پر تخلیقی عمل کی بنیاد رکھی

تھی۔ڈاکٹر انور سدید حیرت انگیز انکشاف کرتے ہیں کہ وزیر آغا نے ادب کے راستے جست کی کارکردگی پر تخلیقی عمل کا جو نتیجہ نکالا تھا، مغرب میں پرگوجائن نے ٹھیک آٹھ برس بعد طبعیات کے راستے یہی نتیجہ اخذ کیا۔ پھر 1980 میں ایلون ٹافلر نے اپنی کتاب 'تیسری لہر' "The Third Wave" میں گوجائن کے انکشافات سے اپنا تھیس ثابت کرنے کی جو کوشش کی اس کا بنیادی خیال بھی وزیر آغا کی کتاب 'تخلیقی عمل' میں موجود ہے۔انور سدید نے باقاعدہ اقتباسات اور حوالوں سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔اس انکشاف سے میرا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے۔

وہ مغرب جو جدید علوم کی سطح پر اپنی سوچ کے مقابلے میں مشرق کی سوچ کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ ہمارے ملک کا ایک دانشور اس میدان میں ان سے پہلے سوچتا ہے۔جن خطوط پر اس نے 1970 میں سوچا تھا مغرب دس سال بعد اس سوچ تک پہنچا ہے۔یہ مشرق کی علمی سرخروئی کا ایک اور ثبوت ہے۔ایسا ہی ایک ثبوت اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عظیم سپوت ڈاکٹر عبدالسلام چند برس پہلے دے چکے ہیں۔

وزیر آغا کے ہاں ادبی سطح پر ذہنی کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔'وزیر آغا کی تکنیک' کے تحت انور سدید نے وزیر آغا کا یہ حوالہ درج کیا ہے:

''پچھلے دنوں ایک نجی محفل میں اردو کے ایک بزرگ نقاد نے کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میرے لئے اس کتاب کو پسند کرنا ناممکن ہے، اس لئے کہ یہ تو میرے عقائد ہی کے خلاف ہے اور میں سوچنے لگا کہ ادب کی پرکھ کے سلسلے میں اگر عقیدے کو کسوٹی مقرر کیا جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟''

وزیر آغا کا یہ سوال ادب میں ایک بھیانک صورت حال کی طرف اشارہ کر رہا ہے لیکن آپ اس سوال کو سیاست اور کاروبار زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی چسپاں کر کے دیکھ لیں جہاں ایسی ذہنیت ہوگی وہیں بھیانک منظر ہوں گے۔

فن اور نظریات کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا سے انٹرویو میں ایک سوال کیا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے موقف کو یوں واضح کیا:

''میں فن کو کسی نظریاتی یا اخلاقی مقصد کے لئے شعوری طور پر استعمال کرنے کے نظریوں کو تخلیقِ فن کے سلسلے میں مضر قرار دیتا ہوں۔البتہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر کوئی نظریہ چاہے وہ اخلاقی نشاۃ ثانیہ سے متعلق ہو یا نظریاتی یوٹوپیا سے، فنکار کی ذات کا حصہ بن جائے تو لامحالہ فن کار کی تخلیق میں شامل ہو جائے گا اور میرے نزدیک اس کی شمولیت کی یہی ادا مستحسن ہے ورنہ اگر شعوری طور پر مقصد کو فنی تخلیق میں سمونے کی کوشش ہوگی تو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند صاف دکھائی دینے لگے گا۔''

وزیر آغا نے اپنے اس موقف کی روشنی 'اوراق' کے اولین شمارے سے ہی عام کرنا شروع کر دی تھی، ان کے موقف کا جادو یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی جیسے کالم نگار جو وزیر آغا کے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے وہ بھی 'معاصر' نکالتے ہیں تو اس کے اولین اداریے میں اسی شد و مد سے وزیر آغا کے موقف کو اپنا موقف بنا کر پیش کرتے ہیں جس شد و مد سے وزیر آغا کی مخالفت کرتے ہیں۔

اردو انشائیہ اور وزیر آغا لازم و ملزم کی حیثیت رکھتے ہیں۔انور سدید نے وزیر آغا کے مطالعہ میں اس حیثیت کو مضبوط دلائل کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔'فصل ہفتم' میں وزیر آغا کے انشائیہ 'چیخنا' کا اختتام ان لفظوں کے ساتھ ہوتا ہے:

''میں جب اس چیخ کو سنتا ہوں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور نجانے کیوں مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔یقیناً ریل کی اس چیخ کا میرے بچپن سے کوئی گہرا تعلق ہے، لیکن کیسا تعلق، یہ بات میں نہیں جانتا۔''

ریل کی چیخ کو اپنے بچپن کے کسی انجانے تعلق سے مربوط کرنے کے باوجود وزیر آغا شعوری طور پر اس تعلق کی وضاحت نہیں کر سکتے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر ان سے اس تعلق کی نوعیت بھی ظاہر ہو گئی ہے۔انور سدید نے فصل ہفتم میں وزیر آغا کی نظم 'ٹرمینس' بھی شامل کی ہے۔اس نظم کا مرکزی دھاگہ ان کا وہ بچپن ہے جب وہ اپنے بابا کے ساتھ چھنی کھچی اسٹیشن کو دیکھنے جاتے ہیں۔فرطِ شوق سے لبریز اس بچپن میں یہ منظر بھی آتا ہے:

'چھنی کھچی کی بو سونگھ کر کالے انجن نے
فرطِ مسرت سے
اک چیخ ماری تھی

——

پھر اچانک مجھے میرے بابا نے
پینک سے بیدار ہو کر کہا
لو سفر کٹ گیا
اب اٹھو
گاڑی رکنے کو ہے اپنی چیزیں سنبھالو
زمیں پر اتر کر، اسے دیکھ کر
اپنی حسرت نکالو'

ریل کی یہی وہ چیخ ہے جس کا پس منظر انشائیہ 'چیخنا' میں اپنی موجودگی کا احساس تو دلاتا ہے لیکن سامنے نہیں آتا، نظم 'ٹرمینس' میں کھل کر سامنے آ گیا۔ انور سدید صاحب اس طرف توجہ کرنا بھول گئے۔ بھولنے کی بات آ ہی گئی ہے تو انور سدید کی ایک اور بھول کا بھی تذکرہ ہو جائے۔ وزیر آغا کے ہاں ماں کی علامت مختلف معنویتوں کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ انور سدید نے اس علامت کے حوالے سے وزیر آغا کی تمام متعلقہ نظموں کو سمیٹ لیا ہے لیکن 'جزیرے' جیسی اہم نظم کو بالکل بھول گئے جب کہ اس میں دھرتی کے حوالے سے ماں کا امیج ایک بالکل نئے اور انوکھے انداز میں سامنے آیا ہے۔ یہ کرۂ ارض پر خشکی اور پانی کا جو تناسب ہے، وہی انسانی جسم میں مائع اور ٹھوس کا تناسب ہے۔ پانی ماں ہے اور خشکی ایسا جزیرہ جو ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ یوں اس کرہ ارض اور انسان میں ایک عجیب مماثلت سامنے آتی ہے۔

انور سدید نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ ایلیٹ اور حالی کی تنقید اور شاعری الگ الگ شخصیتوں میں بٹی ہوئی ہے اور پھر وضاحت کی ہے کہ:

''ایلیٹ اور حالی کے ہاں تو شاعر اور نقاد ایک ہی وجود کا حصہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے فاصلے پر کھڑے نظر آتے ہیں لیکن وزیر آغا کے ہاں انہیں مقام اتصال مل جاتا ہے۔''

یہاں بھی انور سدید نے ایلیٹ اور حالی کے اسماء پر اکتفا کر لیا ہے وگرنہ اردو میں ایسے اور بھی بہت سے نام مل جاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے اپنی تنقید میں اردو شاعری سے اتنے کڑے مطالبے کئے کہ اچھے اچھے شعرا پریشان ہو گئے، لیکن جب انہوں نے خود شاعری فرمائی تو وہ تیسرے درجے کے معیار پر بھی پوری نہیں اتری، سلیم احمد نے اپنی تنقید میں جو اخلاقیات پیش کی ہے ان کی شاعری کا معیاری حصہ اس سے پاک ہے اور جس حصے پر انہوں نے اخلاقیات کا پھندہ فٹ کیا ہے وہاں شاعری پروپیگنڈہ کی سطح پر اتر آئی ہے۔ میرا خیال ہے ان دو نقاد شعرا کا تذکرہ بھی کتاب میں آ سکتا تھا۔ ان کے اپنے تنقیدی فیصلوں کی روشنی میں ان کی شاعری کو بآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور کمی جو مجھے محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ اردو انشائیہ جس نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود اپنا باوقار مقام بنا لیا ہے۔ اس کی تنقید مغرب میں انشائیہ کی تنقید سے کہیں زیادہ بہتر اور واضح ہے۔ یہاں تک کہ اب خود مغرب والے بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ وزیر آغا کی بہت بڑی عطا ہے۔ انور سدید نے اس حقیقت کا کہیں اظہار نہیں کیا۔ یہ چند ایسی کمیاں ہیں جو مجھے ذاتی طور پر محسوس ہوئیں، تاہم اس سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

انور سدید نے وزیر آغا کے ادبی مقام کے تعین میں بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''وہ عالمی سطح کے ان عہد ساز ادیبوں کے دوش بدوش کھڑے ہیں جنہوں نے ادب پر اپنے مستقل اثرات ثبت کئے اور تنقیدی مباحث سے اس کا رخ موڑنے کی کوشش کی''۔

انہوں نے مقدار اور معیار دونوں زاویوں سے اردو ادب کو اتنی جاندار تحریریں دی ہیں کہ ذہنی تحفظات اور تعصّبات کے باوجود ان کے فن کا اور ادب پر ان کے اثرات کا اعتراف بڑے پیمانے پر کیا جا رہا ہے چنانچہ وزیر آغا کو ایسے ادباء اور مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے جن کے نظریات، تصورات اور افکار نہ صرف اپنے عہد کے لئے اہم ہوتے ہیں بلکہ جو آنے والے زمانوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا کے بارے میں یہ مدلل اور متوازن کتاب لکھتے ہوئے محبت اور عقیدت کے باوجود محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔اس کتاب سے جو وزیر آغا ابھرے ہیں وہ میرے لئے مانوس ہونے کے باوجود کئی جہات سے اجنبی ہیں۔ان جہات سے میرا ان کا یہ پہلا تعارف انور سدید کے وسیلے سے ہوا ہے۔یہ تعارف تحیر خیز بھی ہے اور مسرت آمیز بھی۔اس تعارف کے بعد میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اس عہد کے اس عظیم مفکر، ادیب اور دانشور کے بارے میں میں بھی کوئی کتاب لکھ سکوں۔

کاش میں ایسا کر سکوں!۔۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے کچھ باتیں

حیدر قریشی: ۔آغا صاحب! آپ کو اتنا پڑھا ہے۔ملاقاتوں میں اتنی باتیں کی ہیں مگر اب آپ سے انٹرویو کرنے لگا ہوں تو یہی نہیں سوجھتا کہ بات کہاں سے شروع کروں؟

وزیر آغا: ۔جو سامنے آتا ہے اسی سے بات کا آغاز کر دیں۔جو چھپا ہوگا اس تک آپ پہنچ ہی جائیں گے۔

حیدر قریشی: چلئے یونہی سہی! ابن العربی نے کہا تھا کہ اس عالم کا ظاہر تو بلاشبہ مخلوق ہے مگر اس کے باطن میں خود اللہ تعالیٰ جلوہ فرما ہے۔اس سے پہلے یہی بات باانداز دگر یونانی فلسفیوں نے بھی کہی اور ویدانت والے بھی اس سے ملتی جلتی بات کرتے رہے ہیں۔اب طبعیات کے تازہ ترین انکشافات نے ایٹم کو رشتوں کا ایک جال قرار دیا ہے۔کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید سائنس ہمارے قدیم تصوف کی تصدیق کر رہی ہے؟

وزیر آغا: ۔مگر سوال یہ ہے کہ خود ہمارا قدیم تصوف کس کی تصدیق کر رہا ہے؟ کیونکہ قدیم تصوف سے بھی کم و بیش دس ہزار برس پہلے جنگلی قبائل میں میناMANA کا تصور رائج ہو چکا تھا جو در اصل ایک ایسی پراسرار قوت کا تصور تھا جو پوری کائنات میں دھند کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔جس بھی شے میں یہ قوت اکٹھی ہو جاتی تھی جیسے مثلاً کسی پہاڑ، درخت، دریا، آگ، سیارہ یا انسان میں تو وہ متبرک سمجھا جاتا تھا۔قدیم قبائل کا شیمن بھی جو مینا کی قوت کا مظہر قرار پایا تھا ایک ایسا ہی متبرک انسان تھا۔مگر خود قوت ہر چیز میں جاری و ساری تھی۔تاریخ کے ادوار میں حاضر اور غائب کے جو تصورات ابھرے ان میں سے بیشتر میں یہی صوفیانہ انداز نظر کارفرما تھا۔سپائی نوزا نے لکھا کہ جو نسبت دائرے کے قانون کو دائرے سے ہے وہی نسبت خدا کو اس کائنات سے ہے۔ایک اور

صاحب نظر کا قول ہے کہ خدا ایک ایسا دائرہ ہے جس کا مرکز تو ہر جگہ ہے مگر جس کا محیط کہیں نہیں ہے۔۔بیسویں صدی کے آغاز میں سوسیور نے لانگ کا جو تصور دیا وہ بھی صوفیانہ مسلک ہی سے مشابہ تھا۔سوسیور نے کہا کہ زبان کے دو حصے ہیں۔۔ایک گفتار یا تحریر والا حصہ جسے اس نے پیرول کا نام دیا اور دوسرا لانگ والا حصہ جس سے اس کی مراد لسانی سسٹم تھا۔سوسیور کہہ رہا تھا کہ لسانی سسٹم۔۔گفتار یا تحریر میں موجود ہو تو وہ بامعنی قرار پائے گی ورنہ وہ محض ''شور'' ہے۔مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ گفتار یا تحریر کی موجودگی ہی سے لسانی سسٹم کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے ورنہ وہ نظروں سے غائب ہوتا ہے۔ہاکی کا کھیل ہو رہا ہو تو ہاکی کے کھیل کا سسٹم (اس کا قانون) نظروں سے غائب ہوگا مگر سب جانتے ہیں کہ نظر نہ آنے کے باوجود پورے کھیل میں جاری وساری ہے۔کائنات پر اس کا اطلاق کریں تو محسوس ہوگا کہ مظاہر کا یہ عظیم پیرول یعنی کائنات صرف اس لئے بامعنی ہے کہ اس میں حقیقت عظمیٰ بطور لانگ یا سسٹم کارفرما ہے۔جو ہر چند کہ نظر نہیں آتی لیکن جس کی موجودگی کو بعض لوگ محسوس کرنے پر قادر ہیں۔

حیدر قریشی:۔تو کیا جدید سائنس نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟

وزیر آغا:۔انیسویں صدی کے آخر ایام تک نیوٹن کی طبعیات کا بول بالا تھا۔جو نظام شمسی کے ماڈل کے مطابق تھی یعنی جس کا ایک مرکزہ تھا اور سیارے اس مرکزہ کے گرد گھوم رہے تھے نیوٹن کی کائنات میں زماں اور مکاں مطلق اکائیاں تھیں اور ایٹم مادے کی وہ ٹھوس اینٹیں تھیں جن سے یہ کائنات اُساری گئی تھی۔مگر جدید سائنس نے ایک اور ہی منظر نامہ پیش کر دیا۔اب کھلا کہ زمان ومکان مطلق اکائیاں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسری سے مشروط ہیں۔اور ایٹم بھی کوئی ٹھوس مادی وجود نہیں رکھتا بلکہ رشتوں کا ایک جال ہے۔مثلاً ایٹم کے اندر اس کا ایک مرکزہ یا نیوکلس تو ہوتا ہے مگر جب اس نیوکلس کے اندر جھانکیں اور ان ذرات یعنی PARTICLES کی کارکردگی کو دیکھیں جنہیں ہیڈ رونز HADRONS کہا گیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ قابلِ تقسیم ہیں بلکہ یہ کہ وہ کوارکس QUARKS میں تقسیم ہو گئے ہیں۔نیز یہ کہ کوارکس کا اپنا کوئی مادی وجود نہیں ہے۔وہ محض رنگ یا خوشبوئیں ہیں۔وہ ایک طرح کی گوند بھی ہیں جس نے نیوکلس کو اندر سے جوڑ رکھا ہے اور یہ گوند

کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ایٹم کی جو دنیا اب منکشف ہوئی ہے اس میں مرکزہ کوئی الگ وجود نہیں رکھتا بلکہ رشتوں کے پورے جال پر مشتمل ہے۔یہی صوفیانہ مسلک بھی ہے کہ حقیقتِ عظمیٰ جو پردہ اخفا میں ہے مظاہر میں جاری وساری ہے۔اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ خود مظاہر کی کائنات بھی حقیقتِ عظمیٰ کے انگنت ''چہروں'' میں سے ایک چہرہ ہے۔

حیدر قریشی:۔لکیر کے فقیر معاشرے میں آزادانہ غور وفکر کرنے والوں کے لئے ایک طرف آگہی کی اذیت ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرے کی ملامت! کیا وہ لوگ زیادہ سکھ میں نہیں ہوتے جو اپنی باگیں معاشرے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔فکری سطح پر بھی اور ادبی سطح پر بھی!

وزیر آغا:۔بات تصوف کی ہو رہی ہے تھی۔اس لئے میرا قیاس ہے کہ پہلے آپ کا ذہن منصور کی طرف منتقل ہوا اور پھر فرد اور معاشرے کی طرف! معاشرے کی برہمی سے تخلیق کار کو زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ معاشرہ تو اس ماں کی طرح ہے جو بچے کی مسلسل شرارتوں پر سیخ پا ہو جاتی اور اسے بد دعائیں دینے لگتی ہے۔۔اللہ کرے تو مر جائے تیرا جنازہ نکلے وغیرہ اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ بچے کو چوم چوم کر بے حال کر دیتی ہے۔معاشرہ فرد کی آزادہ روی پر برافروختہ ضرور ہوتا ہے مگر تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کہ اس نے کیسے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس آزادہ روی کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ قبول بھی کر لیا۔مگر شرط یہ ہے کہ ''آزادہ روی'' میں سچائی کے عناصر موجود ہوں ورنہ انحراف برائے انحراف تو بے معنی بات ہے۔تصوف کی کہانی آپ کے سامنے ہے کہ اس میں سچائی کے عناصر موجود تھے۔جبھی تو ابتدائی برہمی کے بعد معاشرے نے اسے تھوڑا سا تبدیل کر کے قبول کر لیا۔سائنس کے میدان میں گلیلیو اور فلسفے کے میدان میں سقراط کا قصہ بھی آپ جانتے ہیں۔معاشرے کے ابتدائی شدید ردعمل کے پیش نظر فرد کا احساس شکست میں مبتلا ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔رہا آگہی کی اذیت کا مسئلہ تو اسے بھی ماں کے رویے کی روشنی میں دیکھیں تو بات بنے گی۔ ہر عورت دردزہ سے گزر کر بچہ جنتی ہے۔اگر وہ دردزہ کو ناقابل برداشت اذیت قرار دے اور پھر اس سے فرار حاصل کرے تو انسانی نسل کا خدا ہی حافظ ہے۔اسی طرح اگر معاشرے کی برہمی سے یا آگہی کی اذیت سے بچنے کے لئے انسان ''آزادہ روی'' کے

مسلک کو ترک کر دے تو اس سے خود انسانی معاشرہ اور انسان کا باطن بانجھ ہو کر رہ جائے۔ ویسے جس اذیت کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ اصلاً مسرت انگیز اذیت ہوتی ہے۔ اس اذیت کا ایک اپنا لطف ہے۔ تخلیق کار ہی اس لطف سے آگاہ ہے چاہے تخلیق کار ماں ہو یا شاعر۔ آپ خود بھی تو آگہی کی اذیت سے بار بار گزرے ہیں اور اس کا مزا چکھ چکے ہیں ورنہ کبھی اتنے اچھے شعر، افسانے یا انشائیے تخلیق نہ کر پاتے۔ کیا تخلیق کی یہ اذیت بجائے خود ایک روحانی یافت نہیں ہے؟

حیدر قریشی:۔ میں نے حال ہی میں آپ کی کلیات ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' پر اپنا طویل مضمون مکمل کیا ہے۔ اسی دوران مجھے یوں لگا ہے جیسے آپ کی بعض چھوٹی نظمیں بعد میں آنے والی طویل نظموں کا پیش خیمہ تھیں۔ مثلاً صفحہ 283 کی ''واپسی'' اور صفحہ 496 کی واپسی:۔۔۔ دونوں نظمیں اپنی اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود ایک لمبی واپسی کی تیاری کا ابتدائی مرحلہ لگتی ہیں۔ یہ لمبی واپسی ''آدھی صدی کے بعد'' میں کھل کر سامنے آئی۔۔۔ اسی طرح صفحہ 264 کی ''جب اور اب'' اور صفحہ 169 کی ''ترغیب''۔ ایسے لگتا ہے کہ ان دونوں نظموں کے اندر ''اک کتھا انوکھی'' کے امکانات مخفی تھے۔ پھر صفحہ 441 کی آویزش میں مجھے ''الاؤ'' کے امکانات دکھائی دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوا ہے لیکن کسی مرحلے پر آپ کو اس کا احساس ہوا کہ ایسا ہو رہا ہے یا ہو گیا ہے؟

وزیر آغا:۔ آپ کے آزاد تلازمہ خیال کی داد دیتا ہوں کہ آپ کس طرح اپنی ''آگہی کی اذیت'' سے میری ''آگہی کی اذیت'' تک جا پہنچے۔ تو جناب! قصہ یہ ہے کہ ''ہو رہا'' کا احساس تو مجھے کبھی نہیں ہوا البتہ ''ہو گیا ہے'' کا احساس کئی بار ہوا ہے۔ مگر جو مثالیں آپ نے دی ہیں ان کے بارے میں مجھے یہ علم نہیں تھا کہ ان کا آپس میں ایک گہرا داخلی رشتہ بھی ہے۔ دراصل نظم لکھتے ہوئے انسان کی حالت ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' کی سی ہوتی ہے۔ ایک بار تخلیقی مشین چل پڑے تو پھر شاعر خود کو اس کے رحم و کرم پر پاتا ہے۔ گو میرا یہ بھی خیال ہے کہ گھوڑے کی باگ ہمہ وقت اس کے ہاتھ میں ہونی چاہئے تاکہ وہ اسے گڑھوں اور خندقوں سے بچا سکے۔ تاہم اگر وہ تخلیق کے گھوڑے کو راستہ دکھانے کی کوشش کرے گا تو پھر شاید ہی وہ اصل منزل تک پہنچ

پائے۔ آپ نے ''آدھی صدی کے بعد'' کا ذکر کیا ہے۔ یقیناً اس نظم کی کرچیاں پہلے کی متعدد نظموں میں موجود ہوں گی۔ آخر جب بارش ہوتی ہے تو پہلے ہلکی سی بوندا باندی بھی تو ہوتی ہے۔ کئی بار رک رک کر، پھر اچانک بارش ہونے لگتی ہے۔ یہی حال نظم کا ہے۔ ہر طویل نظم پہلے کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں ضرور بکھری ہوتی ہے۔۔ نقاد کا یہ کام ہے کہ وہ شاعر کو اس طور پر پڑھے کہ نظم محض ایک لمحہ کی داستان نظر نہ آئے، گزرے ہوئے زمانوں کی کہانی بھی لگے۔ شاعر کے اندر ازل سے ابد تک کے سارے فاصلے سمٹے ہوتے ہیں مگر ان فاصلوں کی نشاندہی کرنے والے سنگ ہائے میل آگے پیچھے اس کی نظموں میں ابھرتے رہتے ہیں۔ نقاد جب ان سنگ ہائے میل کو پڑھتا ہے اور انہیں از سر نو مرتب کرتا ہے تو شاعر کی وہ کہانی ابھر آتی ہے جو دراصل تمام شاعروں کی ایک مشترک داستان ہے۔ ''آدھی صدی کے بعد'' کا قصہ یہ ہے کہ پہلے یہ ایک چھوٹی سی نظم کی صورت میں نازل ہوئی مگر کچھ عرصہ کے بعد اندر سے آوازیں آنے لگیں کہ میں ابھی مکمل نہیں ہوں، مجھے مکمل کرو!۔۔ میں آپ سے سو فی صد متفق ہوں کہ میری نظموں کی ORGANIC GROWTH ہوئی ہے جو محض نظم کے اندر نہیں ہوئی بلکہ مختلف نظموں کے ربط باہم کے ذریعے بھی ہوئی ہے۔

حیدر قریشی:۔ ابتدائی نظموں میں بعد کی طویل نظموں کے امکانات اپنی جگہ۔۔ پھر یہ امکانات کھل کر سامنے بھی آ گئے ہیں۔ لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ کہیں بھی نہ آپ خود کو دہراتے ہیں نہ آپ کی علامتوں اور استعاروں کی تازگی میں کوئی کمی آتی ہے۔ بلکہ یہ تازگی مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ کیا بھید ہے؟

وزیر آغا:۔ اس سوال کا رخ میری طرف نہیں ہے خود کلامی کے انداز میں آپ نے یہ سوال خود سے کیا ہے۔ البتہ میرے لئے یہ بات انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ آپ نے میری نظموں کے مطالعہ سے یہ تاثر قبول کیا۔ کیونکہ میں ایک بات کا بار بار اظہار کرتا آیا ہوں کہ شاعری اگر کلیشوں کے بوجھ تلے دبی رہے، علامتوں اور استعاروں کی تازگی سے محروم ہو تو وہ شاعری نہیں محض منظوم نثر ہے۔ دراصل شاعر اس وقت تک شاعر ہے جب تک وہ اپنے ارد گرد کو ایک بچے کی سی حیرت کے ساتھ دیکھتا ہے۔ جب حیرت منہا ہو جاتی ہے اور وہ خود ایک روبوٹ بن کر روز مرہ کے

معمولات سے گزرنے لگتا ہے تو اسے اشیا، تعقلات اور سچائیاں، بنی بنائی خوبصورت ریپرز میں بند کھائی دینے لگتی ہیں۔ عام زندگی بسر کرنے کے لئے ایسا ہونا مفید ہے لیکن تخلیق کاری کے سلسلے میں یہ ایک رکاوٹ ہے۔ کیونکہ جب تک تخلیق کار عادت اور تکرار کے حصار سے باہر نکل کر شے کو بہ اندازِ دگر نہ دیکھے وہ اس تخلیقی تجربے سے آشنا نہیں ہوسکتا جو جمالیاتی حظ کا بھی باعث ہے اور وژن کی کشادگی کا بھی۔۔اردو شاعری کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ روایت اور سند کے نام پر ہم نے زیادہ تر چبائے ہوئے نوالوں کو چباتے چلے جانے پر ہی اکتفا کیا ہے، یہ عمل شاید گوالوں کے اس کلچر کی باقیات میں سے ہے جو ہمارے قومی کلچر کے بطون میں آج بھی موجود ہے۔ تاہم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جبلت کی سطح پر انسان کے حیوانی دور کی باقیات میں سے ہو۔ چیونگم سے لگاؤ یا پان چبانے کی عادت کو بھی اس حیوانی دور سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔ مگر تخلیق کار کا عمل جگالی کے عمل سے ایک واضح انحراف کی حیثیت رکھتا ہے۔

حیدر قریشی: ۔آپ کی ایک مختصر سی نظم۔۔دستک! یہ نظم اظہر جاوید کے رسالہ تخلیق میں چھپی تھی تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ تب میں نے ''تخلیق'' میں چھپنے والے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ مجھے اس نظم میں ایک طویل نظم کا امکان نظر آرہا ہے۔ آپ کو بھی ایسا محسوس ہوا ہے یا نہیں؟

وزیر آغا: ۔ یقیناً! اس لئے بھی کہ اس کے بعد کی بعض چھوٹی نظموں میں بھی یہ ''دستک'' مجھے صاف سنائی دی ہے۔ اصولاً اسے ایک طویل نظم میں ڈھل جانا چاہئے تھا مگر ایسا ہوا نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل کا اپنا پروگرام اور اپنی صوابدید ہوتی ہے۔ وہ شاعر کا تابع مہمل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر شاعر بار بار اپنا کشکول اس کے آگے کرے اور کہے: ''ہے داتا! مل جائے کچھ دان'' تو عین ممکن ہے کہ اسے دان مل جائے۔ میرے معاملے میں کشکول آگے کرنے کے باوجود اگر ایسا نہیں ہوا تو اس میں کچھ قصور میرا اپنا بھی ہے۔ میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے۔۔''دستک اس دروازے پر'' اس کے پہلے باب کا آغاز ہی نظم ''دستک'' سے ہوا ہے۔ لہذا ایک طویل نظم میں ڈھلنے کے بجائے یہ نظم ایک نثر پارے میں ڈھل گئی ہے۔ مگر نثر شاعری کے مقام کو کیسے پہنچ سکتی ہے! لہٰذا میں منتظر بیٹھا ہوں۔ کوئی چھینٹا پڑے تو کلکتہ کا سفر اختیار کروں مگر میرے

پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ لہٰذا آپ میری سفارش کریں۔ اگر محترمہ کورخ زیبا دکھانا ہے تو یہی وقت ہے۔ ورنہ بہت دیر ہوجائے گی۔

حیدر قریشی: ۔آپ کی نظموں کے مطالعے کے دوران میں نے ایک انوکھی چیز دیکھی ہے۔ ایک طرف تو آپ کی محبت جسم سے اوپر اٹھ کر روحانی سطح پر مظاہر اور مناظرِ فطرت سے تعلق قائم کرتی ہے۔ دوسری طرف آپ ان مظاہر مثلاً خوشبو، ہوا، بجلی، خاموشی وغیرہ کو جسم کا روپ دے دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ان مظاہر نے انسانی روپ دھار لیا ہے۔ جسم اور روح کی اس کشمکش کو آپ کیا کہیں گے؟

وزیر آغا: ۔نہایت عمدہ سوال ہے! مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے میری نظموں کو اتنے غور سے پڑھا ہے کہ اس کی لطیف ترین سلوٹیں بھی آپ کی گرفت میں ہیں۔ زمین سے اوپر اٹھنا اور پھر اوپر جا کر واپس زمین کی طرف آنا ایک پراسس کا نام ہے جو تخلیقی عمل کا ضروری حصہ ہے۔ اصلاً یہ قوس کا انداز ہے۔ آج سے کم وبیش پچاس برس پہلے میں نے لن۔یو۔ٹانگ کی ایک کتاب پڑھی تھی جس میں اس نے فن کو فاختہ کی پرواز سے تشبیہ دی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ جب فاختہ کسی درخت کی شاخ سے اڑتی ہے تو پہلے عمودی انداز میں آسمان کی طرف جاتی ہے۔ پھر اپنے پروں کو کھول کر ایک قوس سی بناتی ہوئی، دوبارہ درخت کی شاخ پر آبیٹھتی ہے۔ بس یہ قوس ہی فن ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کو لیں۔ یہ بھی ایک قوس ہے جو ایک شے سے دوسری کی طرف آتی ہے اور پھر اسے چھو کر پہلی شے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ رقص میں رقاصہ مرکزی نقطے کے گرد گھومتی چلی جاتی ہے۔ ہر بار اسے مس کر کے رخصت ہوتی ہے مگر چکر سا لگا کر دوبارہ مس کرنے کے لئے حاضر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کا LOVE - PLAY ہے۔ اگر میری نظموں میں آپ کو یہ LOVE-PLAY نظر آیا ہے جو تجسیم سے تجرید اور پھر تجرید سے تجسیم کی طرف ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میری شاعری فن کے تقاضوں کے تحت قوسوں میں سفر کر رہی ہے، نظریاتی شاعروں کی نظموں کی طرح سیدھی لکیر پر گامزن نہیں ہے۔

حیدر قریشی: ۔آپ کی جملہ تنقیدی کتب بالعموم اور ''اردو شاعری کا مزاج''، ''نظم جدید کی

کروٹیں''، ''تصوراتِ عشق وخرد''، ''تنقید اور جدید اردو تنقید'' اور ''دستک اس دروازے پر'' جیسی کتب بالخصوص اہلِ ادب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ان پر گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔لیکن آپ کی ایک اہم کتاب ''تخلیقی عمل'' جو اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بے حد اہم تھی اس پر اہلِ ادب نے زیادہ توجہ نہیں دی۔۔۔اس کی کیا وجہ ہے؟

وزیر آغا:۔ ویسے تو ''تخلیقی عمل'' کے بھی متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ پاکستان میں بھی اور بھارت میں بھی! البتہ بھارت میں یہ کتاب نسبتاً زیادہ پڑھی گئی ہے۔اور اس کا ذکر بھی ہوتا رہا ہے۔مگر میں آپ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں اس کتاب پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ میں نے اس کتاب میں استقرائی عمل کے تحت تخلیقی عمل کا ایک پیٹرن دیگر علمی شعبوں مثلاً حیاتیات، سوشیالوجی، متھ اور تاریخ میں دریافت کیا ار پھر اس کا اطلاق ادب پر کیا جبکہ پاکستان کے اردو ادبا کو ان علمی شعبوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔مگر ادھر کچھ سالوں سے صورتِ حال تیزی سے تبدیل ہوئی ہے۔ بالخصوص ساختیات اور پسِ ساختیات کے مباحث نے پاکستان کے اردو ادبا کو دیگر علوم سے روشنی حاصل کرنے کی تحریک دی ہے۔چنانچہ اب ''تخلیقی عمل'' کے موضوع اور اسی حوالے سے میری اس کتاب پر باتیں ہونے لگی ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور میں مجھ سے اس موضوع پر ایک لیکچر دینے کے لئے بھی کہا گیا جس میں لوگوں نے بے حد دلچسپی لی ۔ پھر اس موضوع پر سرگودھا کی ایک ادبی انجمن نے مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا۔لہٰذا اب آپ کو شکایت نہیں ہونی چاہئے۔لوگ باگ اب ''تخلیقی عمل'' میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

حیدر قریشی:۔ساختیات کے بارے میں بعض ناقدین نے گنجلک اور ژولیدہ مضامین لکھے ہیں جبکہ آپ نے ایک ہی مضمون ''ساختیات اور سائنس'' میں مسئلہ کی بنیادی حقیقت آئینہ کر دی ہے۔ کیا آپ کو ادب کے مظلوم قاری پر رحم آ گیا ہے؟

وزیر آغا:۔ یہ قاری ایسا مظلوم بھی نہیں ہے جیسا کہ آپ کو نظر آ رہا ہے۔اس نے فقط مظلومیت کی چادر اوڑھ رکھی ہے ورنہ اندر سے وہ خاصا ظالم ہے۔موصوف کی عزیز ترین خواہش یہ ہے کہ مطالعہ کتب کے جھنجھٹ میں نہ پڑا جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ مشقت کا یہ کام نقاد کرے اور مطالعہ

کر کے علوم کی تلخیص عام فہم انداز میں اس کے سامنے پیش کرے۔آج کے طلباء بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔کورس کی کتابیں پڑھنے کی بجائے خلاصوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔میں مانتا ہوں کہ ہمارے بیشتر ناقدین نے کچا پکا مطالعہ کیا ہے اور اسے ہضم کئے بغیر اگل دیا ہے اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ وہ لکیر کے فقیر بنے ہیں اور مغربی کتب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ہٹ کر سوچنے کو انہوں نے بدعت سمجھا ہے مگر ہمارے ہاں کچھ اچھے نقاد بھی ہیں جنہوں نے مغربی دانش کو مشرقی دانش کے تناظر میں پڑھا اور پھر مغرب والوں کے اخذ کردہ نتائج سے ہٹ کر اپنے طور پر سوچا اور نتائج سے ہٹ کر اپنے طور پر سوچا اور نتائج مرتب کئے ہیں۔یہی درست رویہ ہے ورنہ مغرب میں لکھی گئی کتابوں کو سامنے رکھ کر مضامین یا کتابیں مرتب کر کے لوگوں کو مرعوب تو کیا جا سکتا ہے، متاثر ہرگز نہیں۔اس قسم کے رویے کے فروغ پانے کی اصل وجہ قاری کی مطالعہ نہ کرنے کی عادت ہے۔مثلاً اگر اس نے ساختیات اور پس ساختیات کا پہلے سے بالاستیعاب مطالعہ کر رکھا ہوتا تو پھر وہ نقاد سے یہ مطالبہ ہرگز نہ کرتا کہ وہ اسے ان علوم کے سلسلے میں جانکاری مہیا کرے بلکہ یہ کہ وہ کوئی ایسی نئی بات کہے جو پہلے کبھی نہ سنی گئی ہو۔ابھی ہمارے بیشتر ناقدین (بالخصوص ساختیات اور پس ساختیات کے مباحث کے حوالے سے) تشریحاتی دور سے گزر رہے ہیں، تخلیقی دور سے نہیں۔اور مظلوم قاری بھی تلخیص پسندی کے دور سے باہر آ کر مطالعہ کے دور میں ابھی داخل نہیں ہوا۔جس روز ایسا ہو گیا تو نقاد بھی مجبور ہو جائیں گے کہ مرعوب کرنے کے بجائے متاثر کرنے کی کوشش کریں۔پرانے زمانے میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ علم حاصل کرنے کے لئے قاری کو چین بھی جانا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔نئے زمانے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسے جرمنی بھی جانا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حیدر قریشی:۔''مجید امجد کی دستانِ محبت'' میں آپ نے جس خوبصورتی اور کمال کے ساتھ مجید امجد کی شاعری سے انکی محبت کی دستان دریافت کی ہے، اسے پڑھنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنے ریکارڈ میں بچی کچھی ساری تصویریں اور خطوط ضائع کر دوں اور پھر آپ سے درخواست کروں کہ آپ میری شاعری میں سے بھی میری داستانیں تلاش کریں۔

وزیر آغا:۔ آپ میں اور مجید امجد میں یہ فرق ہے کہ اس نے تو اپنی داستان محبت پردہ اخفا میں رکھی تھی جب کہ آپ نے اپنی عشقیہ داستانوں کی ایک باقاعدہ فائل تیار کر رکھی ہے۔ ویسے آپ کا یہ اقدام خالصتاً کلاسیکی نوعیت کا ہے کیونکہ ہمارے بزرگ شعرا بھی محبت کے معاملے میں بڑے کشادہ دل تھے اور ہمہ وقت اپنی عشقیہ داستانوں کی تشہیر میں مصروف رہتے تھے۔ مثلاً وہ شعر جس میں شاعر نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ بعد مرگ چند تصاویر بتاں اور حسیناؤں کے خطوط کے سوا اس کے گھر سے کچھ نہیں نکلے گا۔ اس کی زیادہ معروف مثال (جدید دور میں) حضرت جوش ملیح آبادی کی ہے جنہوں نے اپنی اکیس محبتوں کی داستان قلمبند کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس داستان کا زیادہ تعلق متخیلہ سے اور بہت کم حقیقت سے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے کلاسیکی شعرا نے زیادہ تر دلچسپی محبوب کے جنزک نام میں لی تھی اور محبوب کے عشاق کو بھی کمال فراخدلی سے برداشت کیا تھا۔ حتیٰ کہ جدید دور میں بھی صورت حال بہتر نہ ہو سکی۔ فیض نے تو اپنی ایک نظم میں کامریڈ رقیب سے سمجھوتہ بھی کر لیا (غالباً نظریہ ضرورت کے تحت)

تم پہ بھی اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تم کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے
ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے

محبت کے معاملے میں یہ اشتراکی رویہ متخیلہ ہی کا زائیدہ تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لہذا آپ خاطر جمع رکھیں۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں آپ کی جمع کردہ تصویروں اور خطوط میں دلچسپی نہیں لوں گا فقط اس قدر کہنے پر اکتفا کروں گا کہ آپ کی محبت ایک کھلی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ایک ایک ورق کو آپ سینے سے لگائے پھر رہے ہیں۔

حیدر قریشی:۔ انشائیہ اردو میں مغرب سے آیا ہے۔ مخالفت کی شدید آندھیوں کے باوجود اس صنف نے اب اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں۔ کل تک جو مخالفین ٹانگوں کے نیچے سے جھانک کر سمندر کو دیکھنے کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب بغلیں جھانکتے نظر آرہے ہیں۔ آپ نے گزشتہ چالیس برسوں میں مخالفین کی ہر طرح کی زیادتیاں اور بدزبانیاں برداشت کیں اب جب کہ انشائیہ اپنی

بنیاد اور روح کے ساتھ اردو میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے تو آپ مخالفین کی حرکتوں کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں؟

وزیر آغا:۔ یہ سوال تو مخالفین سے کرنا چاہئے کہ وہ اب کیا محسوس کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان کے لئے انشائیہ کا فروغ باعثِ مسرت ہرگز نہ ہوگا۔ میں نے انشائیہ کے سلسلے میں ہونے والی ساری تند و تیز مخالفت پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ساری مخالفت ادبی کم اور نفسیاتی مسئلہ زیادہ ہے۔ اگر انشائیہ کو کسی لاہوری ادیب نے اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ اسے بیسویں صدی کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیتے مگر چونکہ اسے ایک چھوٹے شہر کے ایسے ادیب نے رائج کرنے کی کوشش کی جس کے نام اور کام کو مسترد کرنا ان لوگوں کی سب سے بڑی مصروفیت ہے لہٰذا انہوں نے اس سلسلے میں اخبارات کے ادبی کالموں کو استعمال کیا، مضامین لکھوائے حتی کہ کتابیں تک لکھوائیں اور یوں انشائیہ، انشائیہ نگاروں اور انشائیہ کو رائج کرنے والوں کے خلاف ایک غیر ادبی مہم جاری کر دی۔ پچھلے دنوں مجھے اپنے ایک کرم فرما نے یہ قصہ سنا کر حیران کر دیا کہ جب اس نے ایک بار ان مخالفین کے سرغنہ سے پوچھا کہ آپ انشائیہ کے خلاف اس قدر کیوں ہیں؟۔۔ تو موصوف نے فرمایا کہ مسئلہ انشائیہ کا نہیں ہے۔ مسئلہ اس شخص کا ہے جس کے نام کے ساتھ انشائیہ منسلک ہو گیا ہے۔ ہم نے اصولی طور پر اس شخص کی ہر بات کی مخالفت کرنی ہے۔ اب اگر انشائیہ بھی اس مخالفت کی زد میں آ گیا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ آخر جنگ میں امن پسند شہری بھی تو ہلاک ہو جاتے ہیں۔

حیدر قریشی:۔ آغا صاحب! انشائیہ سے ملتی جلتی صورت حال جاپانی صنف ہائیکو اور پنجابی صنف ماہیا کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔ دونوں اصناف میں تین یکساں مصرعوں کو ہائیکو اور ماہیا بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ دونوں اصناف کا اصل وزن کچھ اور ہے۔ اگرچہ اب اصلاح احوال کی صورت بنتی جا رہی ہے۔ ہائیکو کے اصل جاپانی وزن اور ماہیا کے اصل پنجابی وزن کی طرف توجہ دلانے کے بعد اچھے شعراء اصل وزن کی طرف رجوع کرنے لگے ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ ماہیا کے اصل وزن کے مسئلہ کی طرف سب سے پہلے ''اوراق'' ہی میں نشان دہی کی گئی تھی۔ آپ کی اس بارے

میں کیا رائے ہے؟

وزیر آغا:۔ کسی بھی صنفِ شعر کی پہچان کا تعلق اس کی ہیئت اور مزاج، دونوں سے ہوتا ہے ممتاز عارف صاحب کی نشان دہی کے بعد ماہیا کی ہیئت کی پہچان کرانے کے معاملہ میں آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی ایک تاریخی حیثیت بنتی ہے اور ادب کا کوئی طالب علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اب میرا مشورہ ہے کہ آپ ماہیا اور ہائیکو میں پیش کیے گئے مواد کی طرف بھی متوجہ ہوں تا کہ ان دونوں اصنافِ شعر کا مزاج سامنے آ سکے۔ ان دونوں شعری اصناف کی بقاء کے لئے ان کے مزاج کا تحفظ بہت ضروری ہے ورنہ ہیئت کا معاملہ تو طے پا جائے گا۔ شاعری کا معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔ سنا ہے کہ ایک بار کسی سرجن نے مریض کا آپریشن کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: OPERATION SUCCESSFUL. PATIENT DEAD.

یہی صورتحال ان دونوں اصنافِ شعر کے سلسلے میں پیش آ رہی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ماہیے اور ہائیکو، ہیئت اور مزاج کے اعتبار سے بے مثال ہوتے ہیں مگر بیشتر میں شعری کیفیات کا فقدان ہوتا ہے اور صنف کا مخصوص مزاج بھی غائب ہوتا ہے۔ بالخصوص ہائیکو کے معاملے میں صورتِ حال اچھی نہیں ہے کیونکہ یار لوگوں نے غزل کے مضامین کو تھوک کے حساب سے ہائیکو میں بھرنا شروع کر دیا ہے۔

حیدر قریشی:۔ آپ کی تحریروں میں عمومی طور پر اور آپ کی سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' میں خصوصی طور پر ایسے لگتا ہے کہ ادب، سائنس اور مذہب کی ایک مثلث بنی ہوئی ہے۔ یہاں میں نے سائنس اور مذہب کو ان کے وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ آپ کے ہاں یہ سنگم لاشعوری طور پر ہوا ہے یا آپ نے خود اہتمام کیا ہے؟

وزیر آغا:۔ آپ نے ''شام کی منڈیر سے'' کا خصوصی حوالہ دیا ہے۔ حوالہ ''دستک اس دروازے پر'' کا بھی ہونا چاہئے کیونکہ میں نے اس کتاب میں ان تینوں کے امتزاج کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ عظیم اسرار کو جاننے کے یہ تین راستے ہیں۔ بعض اوقات ان میں سے ایک راستہ صرف ایک حد تک جاتا ہے اور پھر اس میں سے دوسرا راستہ پھوٹ نکلتا

ہے۔ مولانا روم نے تصوف کے باب میں لکھا تھا کہ شکاری کچھ دور تک تو ہرن کے نقوش پا کو دیکھ دیکھ کر اس کا تعاقب کرتا ہے۔ اس کے بعد نافہ آہو کی خوشبو اس کی رہبر بن جاتی ہے۔ ادب، سائنس، اور مذہب، تینوں کا رخ عظیم اسرار کی طرف ہے جسے یہ مس کرنا چاہتے ہیں۔ سائنس، استقرائی اور تجزیاتی انداز اختیار کرتی ہے، ادب جمالیاتی تجربے کو اساس بنا کر آگے بڑھتا ہے جبکہ مذہب روحانی سطح پر منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک سائنس اور مذہب میں آویزش موجود تھی لیکن جب بیسویں صدی میں سائنس کے سابقہ تیقن پر کاری ضرب لگی اور سائنس دانوں کو کائنات کی پراسراریت کا ادراک ہوا تو یہ آویزش بڑی حد تک کم ہو گئی۔ مجھے ان تینوں کے امتزاج کا احساس وہبی طور پر بھی ہوا اور تجزیاتی طور پر بھی! تخلیق کار ہونے کی حیثیت سے میں نے اس یکتائی کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی ہے جو مظاہر کی کثرت اور بوقلمونی کے عقب یا اعماق میں موجود ہے اور تجزیہ نگار ہونے کے حوالے سے میں نے ان مختلف راستوں کی کارکردگی پر ایک نظر ڈالی ہے اور یہ دیکھ کر خوش ہوا ہوں کہ ان سب کا رخ ایک ہی جانب ہے۔

حیدر قریشی:۔ آپ نے امتزاجی تنقید کا جو موقف پیش کی ہے اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا مگر عملاً ناقدین کرام اس طرف آتے نظر نہیں آتے شاید اس لئے کہ ایسی تنقید لکھتے ہوئے تمام علوم پر دسترس کا ہونا ضروری ہے۔ اور ہمارے بیشتر ناقدین جو مخصوص رنگ کی عینک کے عادی ہیں وہ دیگر علوم میں سر کھپانے اور محنت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس صورت حال میں کیا امتزاجی تنقید صرف آپ کے مطالعہ کی امتیازی پہچان بن جائے گی یا رواج بھی پا سکے گی؟

وزیر آغا:۔ اب تک اردو کے اکثر ناقدین نے کسی ایک شعبہ علم، عقیدہ یا مسلک کی روشنی میں تخلیق کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ میرا موقف ہے کہ ہر چند ایسا کرنے میں کوئی ہرج نہیں لیکن چونکہ تخلیق تہ در تہ معنویت کی حامل ہوتی ہے اس لئے تخلیق کا پوری طرح احاطہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے محض ایک مخصوص زاویے سے ہی دیکھا نہ جائے، دوسرے زاویوں کو بھی اس سلسلے میں آزما لیا جائے۔ مثال میں نے یہ دی ہے کہ اگر اندھیرے میں محض ایک قمقمہ جل رہا ہو تو آپ کے جسم سے صرف ایک سایہ برآمد ہو گا لیکن اگر متعدد قمقمے جل رہے ہوں تو ان کی تعداد کے

مطابق آپ کے جسم سے بھی متعدد سایے پھوٹ کر باہر آ جائیں گے۔ یہی حال تخلیق کا ہے۔ اگر تخلیق پر صرف ایک زاویے سے روشنی پڑے تو اس میں سے صرف ایک سایہ (معنی) برآمد ہوگا۔ اگر متعدد زاویوں کو بروئے کار لایا جائے تو سایوں (معانی) کے متعدد سلسلے اس سے منسلک ہو جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نقاد باری باری مختلف زاویوں سے تخلیق کو ٹٹولے بلکہ صرف یہ کہ اس کی اپنی ادبی شخصیت گہری، وسیع، اور کثیر الجہت ہوتا کہ جب وہ تخلیق سامنے آئے تو یوں لگے جیسے متعدد قمقمے جل اٹھے ہیں اور عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ وجود میں آ گیا ہے۔ اکثر نقاد اپنی پوری ادبی شخصیت کے ساتھ تخلیق کے روبرو نہیں آتے۔ وہ نظریاتی دباؤ کے تحت اپنی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو دبا کر تخلیق کے سامنے آتے ہیں اور اسی لئے ان کی تنقید بھی سطحی نظر آتی ہے۔ دراصل تنقید، تخلیق ہی نہیں، خود تنقید نگار کا امتحان بھی ہے۔ تخلیق کا یوں کہ اگر وہ اکہری ہے تو اکہری نظر آئے گی، اگر تہ در تہ ہے تو ایسی ہی دکھائی دے گی۔۔ نقاد کا یوں کہ اگر اس کی ادبی شخصیت، مطالعہ اور تجزیہ کی کمی نیز کسی ایک نظریے کے تابع مہمل ہو جانے کے باعث اکہری ہے تو اس کی تنقید بھی یک طرفہ اور اکہری دکھائی دے گی۔ دوسری طرف اگر اس کے اندر ایک امتزاجی عمل رونما ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت ہمہ جہت اور تہ در تہ نظر آ رہی ہے تو پھر وہ تخلیق کو بھی پرت در پرت کھولنے پر قادر نظر آئے گا۔ تنقید بنیادی طور پر ایک امتزاجی عمل ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے ناقدین زود یا بدیر اپنی نظریاتی قلعہ بندیوں سے آزاد ہو کر تخلیق کی طرف راغب ہوں گے۔ جب ایسا ہوا تو امتزاجی تنقید کی راہیں روشن ہو جائیں گی۔

حیدر قریشی:۔ کتنی ہی بار آپ سے جی بھر کر باتیں کی ہیں لیکن آج جب اس رسمی انٹرویو کے لئے باتیں کرنا پڑیں تو یوں لگا جیسے ایک آزمائش سے گزر رہا ہوں۔ آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے رسمی انٹرویو کے پل صراط سے گزرنے میں میری مدد کی۔

وزیر آغا:۔ حیدر قریشی صاحب! پل صراط پر سے گزرنے کی مبارکباد! مگر جناب! یہ انٹرویو ایسا رسمی بھی نہیں تھا جیسا کہ آپ نے سوچا ہے۔

اوراق اور میں

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۷۹ء کے آخری شمارہ کے ذریعے میری ''اوراق'' میں انٹری ہوئی تھی۔ میری غزل ''اوراق'' میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ غزل کا مطلع تھا:

اک یاد کا منظر سا خلاؤں پہ لکھا تھا   جب ٹوٹتے تاروں سے کوئی جھانک رہا تھا

پھر میرے نام سے میرا پہلا افسانہ ''مامتا''، ''اوراق'' کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا۔ یوں یہ میرا پہلا افسانہ ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے میں افسانہ ''اندھی روشنی'' لکھ چکا تھا اور یہ افسانہ ''جدید ادب'' خان پور کے ۱۹۷۸ء کے کسی شمارہ میں اپنی بیوی (مبارکہ شوکت) کے نام سے چھاپ چکا تھا۔ تب رشید امجد اور بعض دیگر جدید افسانہ نگاروں نے چونکتے ہوئے استفسار کیا کہ یہ مبارکہ شوکت کون ہیں؟۔ تو مجھے اپنے افسانہ لکھنے پر اعتماد سا ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے افسانہ ''مامتا'' تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کو بھیجا۔ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ وہ افسانہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی دیکھ لیا اور یوں وہ افسانہ، میرے نام سے چھپنے والا میرا پہلا افسانہ ''اوراق'' کے ۱۹۸۰ء کے پہلے شمارہ میں شائع ہو گیا۔

میں نے اوپر تلے دو انشائیے لکھے ''خاموشی'' اور ''نقاب''۔ یہ دونوں انشائیے ''اوراق'' کے انشائیہ نمبر میں شائع ہوئے۔ میری خاکہ نگاری کی ابتدا اباجی کے خاکے ''برگد کا پیڑ'' سے ہوئی تھی اور یہ خاکہ بھی ''اوراق'' میں شائع ہوا۔ جہاں تک ادبی رسائل میں چھپنے کا تعلق ہے ''اوراق'' سے پہلے میری تخلیقات ''نگار پاکستان''، ''سیپ'' اور ''نیا دور'' جیسے معیاری ادبی جرائد میں چھپ چکی تھیں۔ اختر انصاری اکبرآبادی کے ماہنامہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد میں تو مسلسل میری تخلیقات چھپتی رہی تھیں لیکن یہ کراچی اور حیدرآباد کے رسائل کے مدیران کی محبت تھی۔ پنجاب میں رہتے ہوئے میں ابھی پنجاب کے ادبی رسائل تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ ''اوراق'' پنجاب کا پہلا

ادبی جریدہ تھا جس نے مجھے نہ صرف ادبی پلیٹ فارم مہیا کیا بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔تعریف کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک گمراہ کرنے والی، دوسری حوصلہ بڑھانے والی۔ وزیر آغا نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کرنے والا انداز اختیار کیا۔بعض تحریروں کے سلسلے میں مشورے بھی دیئے لیکن ان مشوروں کو مجھ پر تھوپا نہیں ۔ میں نے بیشتر مشوروں کو من وعن یا تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ قبول کیا لیکن بعض مشورے اچھے لگنے کے باوجود میں نے قبول نہیں کیے تو ڈاکٹر وزیر آغا نے تب بھی عموماً وہ تحریریں جوں کی توں ''اوراق'' میں چھاپ دی۔''اوراق'' سے میرا تعلق مزید گہرا ہوا تو میں نے ''اوراق'' کے اداریوں کو مرتب کیا۔ بعد میں راغب شکیب بھی میرے شریک مرتب ہو گئے ۔ چنانچہ ''پہلا ورق'' کے نام سے یہ مجموعہ ہم دونوں مرتبین کے نام کے ساتھ کراچی سے راغب شکیب ہی نے شائع کیا۔

''اوراق'' سے تعلق کی نوعیت کے پیش نظر وزیر آغا نے مجھے کئی اہم مشورے دیئے ۔ انہیں نصائح میں شمار کرنا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ میں نے وہ نصیحتیں آج تک پلے باندھ رکھی ہیں۔

ا۔کہیں کلام سنانا پڑ جائے تو سنانے میں کوئی حرج نہیں لیکن مشاعرہ بازی کا شکار نہیں ہونا۔

۲۔ادبی انعامات زیادہ تر شخصی اور ادبی سیاست کی ترجیحات کی بنیاد پر دیئے جاتے ہیں لہٰذا ایسے انعامات کے حصول کی دوڑ میں شامل نہ ہونا۔

۳۔ادبی مجالس میں شرکت سے اپنی ادبی تربیت ہونے کا احساس ہو تو ایسی مجالس میں شریک ہوں بصورت دیگر روایتی ادبی مجالس میں شرکت سے پرہیز کریں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے یہ مشورے حقیقتاً ''ڈاکٹری پرہیز'' کے مشورے تھے۔ان بد پرہیزیوں سے بچ کر میں بہت سی غیر ادبی بیماریوں سے محفوظ ہوں۔ میں پوری ایمان داری سے محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں کسی ایک بد پرہیزی کا شکار بھی ہو جاتا تو مجھے یہ ادبی کام کرنے کی توفیق نہیں ملتی جو اَب مل رہی ہے۔

ثنویت ڈاکٹر وزیر آغا کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔''اوراق'' کے مزاج میں بھی اس کے اثرات مختلف سطحوں پر موجود ہیں۔مثلاً ''اوراق'' مشرقی تصوف کی اہمیت کا احساس بھی دلاتا ہے اور جدید تر علوم سے بھی فیض یاب کرتا ہے۔ادب میں اپنی جڑوں اور اپنی مقامیت پر بھی

اصرار کرتا ہے اور ادب کی بین الاقوامیت (یا آفاقیت) کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ وزیر آغا کے مزاج میں جمالی رنگ ہے جب کہ ڈاکٹر انور سدید کے مزاج میں جلالی رنگ ہے۔ مجھے تخلیقی سطح پر وزیر آغا کے مزاج سے فائدہ ہوا تو تنقیدی سطح پر، خاص طور پر ماہیے کی بحث میں کج بحثی کرنے والوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید کے مزاج سے فائدہ ہوا۔

ماہیے سے یاد آیا کہ ''اوراق'' کے شمارہ اگست ۱۹۹۰ء میں وہ خط شائع ہوا جو آگے چل کر اردو ماہیے کی تحریک کا باعث بن گیا۔اگرچہ اس مسئلے پر ابتدائی مضامین دوسرے رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے اور درست وزن کے ماہیے بھی پہلے دوسرے جرائد نے شائع کیے تاہم یہ حقیقت ہے کہ ''اوراق'' کے شمارہ اگست ۱۹۹۰ء میں چھپنے والا بظاہر ایک عام سا مختصر سا خط ہی اس تحریک کا نقطہء آغاز تھا۔ نیز جب ''اوراق'' نے بھی درست وزن کے ماہیے شائع کرنا شروع کیے تب اس تحریک میں جان سی پڑ گئی۔''اوراق'' نے ماہیے کے خدوخال واضح کرنے کے لیے ماہیے کی بحث کو مضامین کے ذریعے آگے بڑھایا۔یوں سچائی نکھر کر سامنے آتی گئی۔

میں اب تک متعدد ادبی جرائد میں چھپ چکا ہوں لیکن ''اوراق'' واحد ادبی جریدہ ہے کہ ۱۹۷۹ء سے لے کر آج تک میں اس میں باقاعدگی سے چھپ رہا ہوں۔تب سے اب تک کسی ایک شمارہ میں بھی میری غیر حاضری نہیں ہوئی۔''اوراق'' کے پس پردہ ایک خاموش طبع نوجوان بھی موجود ہے۔ یہ نوجوان افسانہ نگار اور انشائیہ نگار سلیم آغا قزلباش ہے۔ میں پاکستان میں بھی اس نوجوان کی نجی خاموشی کے ٹوٹنے کا منتظر تھا اور اب بھی منتظر ہوں کہ کب اس کی خاموشی ٹوٹتی ہے!

''اوراق'' اور میرے تعلق کی نوعیت ایسی ہے کہ اگر اس پر یک سوئی کے ساتھ لکھنے بیٹھوں تو پوری کتاب تیار ہو جائے گی۔ان مختصر سے تاثرات میں صرف چند سرسری اشارے ہی دے پایا ہوں۔ میری ادبی تربیت میں، حوصلہ افزائی میں، صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ''اوراق'' کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔کفران نعمت گناہ ہے لیکن ''اوراق'' کے لیے محض شکر گزاری کے الفاظ ناکافی ہیں۔جس تعلق کی نوعیت محبت جیسی ہو جائے وہاں شکر گزاری کے الفاظ اچھے نہیں لگتے۔

حیدر نئے ادب میں تو گھائل انہیں کا ہوں   رشتہ بہت ہی گہرا ہے آغا وزیر سے

(مطبوعہ ''اوراق'' لاہور خاص نمبر، جنوری۔فروری 2000ء)

اوراق اور ماہیا

اس مضمون کے لئے وزیر آغا صاحب نے مجھے 21 نومبر 1999ء کے خط میں فرمائش کی ہے اور 10 دسمبر تک مضمون طلب بھی فرمایا ہے جبکہ یہاں میرے پاس ''اوراق'' کی مکمل فائل موجود نہیں۔ 1992ء سے پہلے کے چند حوالہ جات اور چند اہم تحریروں کی فوٹو کاپیاں میرے پاس موجود ہیں۔ یوں بیشتر اہم روداد تو اس مضمون میں آ جائے گی تاہم ممکن ہے مزید حوالہ جات دستیاب ہونے کی صورت میں یہ مضمون زیادہ بہتر ہو جاتا۔ (**حیدر قریشی**)

''اوراق'' میں ماہیا نما ثلاثی 1986ء سے ذرا پہلے چھپنا شروع ہوئے تھے۔ نصیر احمد ناصر اور علی محمد فرشی نے اس سلسلے میں اچھا تخلیقی کام کیا۔ ''اوراق'' کے شمارہ اپریل۔ مئی 1987ء میں قیوم طاہر کے اسی انداز کے ''ماہیے'' شائع ہوئے۔ پھر سیدہ حنا اس میدان میں آئیں۔ یہ ''ماہیے'' اپنے مقامی رنگ کے باعث پرکشش تھے۔ خصوصاً مساوی الوزن سہ مصرعی ہائیکو کے مقابلہ میں ان کا رس اور کسی قدر لوک رنگ سے ملتا جلتا انداز زیادہ متاثر کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ماہیے کے وزن کی طرف سب سے پہلے ''اوراق'' میں ممتاز عارف نے توجہ دلائی تھی لیکن شمارہ اگست 1990ء سے پہلے، ممتاز عارف کی نشاندہی سے پہلے، ''اوراق'' کے کسی شمارہ میں حسن عباس رضا کے چند درد بھرے ''ماہیے'' شائع ہوئے تھے۔ ان میں سے دو ماہیے تو مکمل طور پر ماہیے کی لوک لے کی پابندی کر رہے ہیں۔

دل اپنے کشادہ تھے
اس لئے رونا پڑا
ہم ہنستے زیادہ تھے

ہم سہمے پرندے ہیں
سبز رتوں میں بھی
پرواز سے ڈرتے ہیں

سو کہا جا سکتا ہے کہ ماہیے کے درست وزن کی نشاندہی سے پہلے ادبی رسائل کی سطح پر درست وزن کے اولین دو نمونے یہی ماہیے تھے اور یہ ماہیے ''اوراق'' ہی میں شائع ہوئے تھے۔

''اوراق'' کے شمارہ اگست 1990ء میں ممتاز عارف کا وہ تاریخی خط شائع ہوا تھا جس کے بارے میں انہیں خود بھی اندازہ نہ ہوگا کہ یہ ایک تحریک کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ تاہم ممتاز عارف کے خط میں بعض سقم بھی موجود تھے جن میں سب سے بڑا سقم یہ تھا کہ انہوں نے حسرت کے ''ماہیا نما'' کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ ماہیا کر دیا تھا جبکہ مثالی نمونہ پیش کرنے کے لئے فلم ''پھاگن'' اور فلم ''نیا دور'' کے ماہیے زیادہ مناسب تھے۔ ممتاز عارف نے ماہیے کی لے کی بنیاد پر اس کے وزن کو دریافت کرنے کی کاوش تو نہیں کی لیکن ماہیے کے ''مخصوص وزن'' کا اشارہ کر کے انہوں نے ماہیے کی لے کی طرف توجہ کرنے کی راہ ضرور ہموار کر دی۔ پھر انہوں نے مدیر ''اوراق'' سے بجا طور پر یہ گذارش کی کہ ''ماہیوں کی اشاعت کے وقت ماہیے کے مخصوص وزن کو پیش نظر ضرور رکھیں۔''

''اوراق'' کے شمارہ دسمبر 1990ء میں میرے خط میں ممتاز عارف کے موقف کی بھرپور تائید کی گئی اور ساتھ ہی جملہ ''ماہیا نگاروں'' کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ وہ مل کر طے کر لیں کہ اردو ماہیے کو اصل پنجابی ماہیے کی طرح رکھنا ہے یا اس کا حشر بھی ہائیکو جیسا کرانا ہے۔ اس کے بعد ماہیے کی لوک لے کے حوالے سے ''اوراق'' کے خطوط کے صفحات پر تذکرہ تو ہوتا رہا لیکن ابھی اس مسئلے پر کوئی مضمون یا درست وزن کے ماہیے ''اوراق'' میں شائع نہیں ہوئے تھے جبکہ ''ادب لطیف'' لاہور شمارہ نومبر 1990ء میں میرے ماہیے شائع ہوئے اور روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی شمارہ 24 مئی 1992ء میں افتخار احمد کا مضمون ''اردو ماہیے'' شائع ہوا۔ یہی مضمون بعد میں ''صریر'' کراچی اور ''تجدید نو'' اسلام آباد میں بھی شائع ہوا۔ اور میرے ماہیے ''ادب لطیف'' کے معاً بعد ''صریر''، ''ابلاغ'' اور بعض دیگر رسائل میں شائع ہوئے۔ اس عرصہ میں ''اوراق'' میں تین ہم وزن

مصرعوں کے ماہیے شائع ہوتے رہے۔''اوراق'' کے شمارہ نومبر، دسمبر 1992ء میں سعید شباب نے ''اوراق'' میں پنجابی ماہیے کے وزن والے ماہیے چھاپنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا:

''امید ہے دیگر ادبی جرائد کی طرح ''اوراق'' بھی اب اصل وزن کے ماہیے چھاپنا شروع کر دے گا۔''

سعید شباب کے اسی خط کے ساتھ ''اوراق'' کے شمارہ نومبر، دسمبر 1992ء میں ایم اے تنویر کے ''ماہیوں'' کے ساتھ حیدر قریشی اور نوید رضا کے درست وزن کے ماہیے شائع ہوئے۔اس سے اگلے شمارہ میں ایم اے تنویر اور سیدہ حنا کے مساوی الوزن سہ مصرعی ''ماہیوں'' کے ساتھ پھر حیدر قریشی کے ماہیے شائع ہوئے لیکن شمارہ مئی، جون 1993ء کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اس میں ناصر عباس نیرّ کا ایک اہم مضمون ''ماہیا اور اردو میں ماہیا نگاری'' شائع ہوا۔ ماہیے کی تہذیبی و ثقافتی پہچان کے حوالے سے یہ ایسا بنیادی نوعیت کا اہم مضمون تھا جس سے آج بھی نہ صرف استفادہ کیا جاسکتا ہے بلکہ کئی حوالوں سے یہ نئے ماہیا نگاروں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

مضمون کے دوسرے حصہ میں ناصر عباس نیرّ نے دونوں طرح کے ماہیوں کو جائز قرار دیا۔ اس کے جواب میں، میں نے ''ماہیے کے وزن کا مسئلہ'' کے عنوان سے مضمون لکھا۔اسے ''اوراق'' میں خطوط کے صفحات پر شائع کیا گیا تاہم پورا مضمون شائع کر دیا گیا۔ ناصر عباس نیرّ کے مضمون نے ماہیے کے وزن کی بحث کو متحرک کر دیا تھا۔شمارہ نومبر، دسمبر 1993ء میں ایم اے تنویر کے ''ماہیوں'' کے ساتھ حیدر قریشی، رشید اعجاز، نذیر فتح پوری اور غزالہ طلعت کے ماہیے شائع ہوئے۔1994ء سے 1999ء تک چھ سال کے عرصہ میں ''اوراق'' میں ان لوگوں کے ماہیے شائع ہوئے۔

شمارہ	**درست وزن والے ماہیا نگار**	**مساوی الوزن مصرعوں والے ماہیا نگار**
جولائی۔اگست 1994	نذیر فتح پوری، رشید اعجاز	سیما پیروز، نثار ترابی
فروری۔مارچ 1995ء	فرحت نواز، سعید شباب، رشید اعجاز، شجاعت علی راہی	سیما پیروز، نثار ترابی، ایم اے تنویر
اگست۔ستمبر 1995ء	ضمیر اظہر، نذیر فتح پوری، شجاعت علی راہی، یوسف اختر	نثار ترابی، علی محمد فرشی
جنوری۔فروری 1996ء	پروین کمار اشک، حیدر قریشی، نذیر فتح پوری، فرحت نواز، شجاعت علی راہی، مناظر عاشق ہرگانوی	ا*ایم اے تنویر
جولائی۔اگست 1996ء	حیدر قریشی، احمد حسین مجاہد، سعید شباب، قاضی اعجاز محور، اجمل پاشا، ندیم شعیب، نذیر فتح پوری	نسیم سحر، علی محمد فرشی
جنوری۔فروری 1997ء	حیدر قریشی، سعید شباب، پروین کمار اشک، اجمل پاشا	سیما پیروز، سجاد مرزا*۲
جولائی۔اگست 1997ء	شاہدہ ناز، حیدر قریشی، نذیر فتح پوری، یوسف اختر	
جنوری۔فروری 1998ء	سلطانہ مہر، ثریا شہاب، شاہد جمیل، انور مینائی*۴	مناظر عاشق*۳
جولائی۔اگست 1998ء	حیدر قریشی، ثریا شہاب، عارف فرہاد، ذوالفقار احسن، یوسف اختر، رستم نامی	

جنوری۔فروری 1999ء	پرویز بزمی، حیدر قریشی، یوسف علی محمد فرشی اختر، مناظر عاشق، سلطانہ مہر، مسعود ہاشمی
جولائی۔اگست 1999ء	حیدر قریشی، سلطانہ مہر، شرون کمار ورما، ترنم ریاض

جب سے ''اوراق'' میں پنجابی ماہیے کی لے سے مطابقت رکھنے والے ماہیے چھپنا شروع ہوئے ہیں تب سے اب تک غلط وزن میں ''ماہیے'' کہنے والے چھ ماہیا نگاروں کے ''ماہیے'' مجموعی طور پر 16 بار شائع ہوئے اور درست وزن میں ماہیے کہنے والے 28 ماہیا نگاروں کے ماہیے 58 بار شائع ہوئے۔اس صورتحال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوک لے کی بنیاد پر کہا جانے والا ماہیا مسلسل مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ ماہیے کی اس مقبولیت میں ان مباحث کا بہت عمل دخل ہے جو''اوراق'' کے صفحات پر ہوتی رہی ہیں۔

ناصر عباس نیرّ کے مذکورہ بالا مضمون کے بعد ڈاکٹر صابر آفاقی، احمد صغیر صدیقی، نسیم سحر اور ضیا شبنمی نے اپنے خطوط میں اختلافی زاویے کو نمایاں کیا تاہم ان میں سے ڈاکٹر صابر آفاقی بہت جلد ماہیے کے درست وزن کو مان گئے اور احمد صغیر صدیقی سلیقے سے اس بحث سے ہی الگ ہو گئے ۔ویسے احمد صغیر صدیقی نے اپنے اعتراض کے باوجود یہ لکھا کہ

''دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کی کمی کو طبلے کی تھاپ سے پورا کیا جاتا ہے''

جبکہ نسیم سحر نے جو ماہیے کو زیادہ بہتر جانتے ہیں، یہ حیران کن بات لوک لے والے ماہیے کے بارے میں لکھی کہ

''ماہیے کو ترنم سے الاپتے ہوئے جب دوسرے مصرعہ پر پہنچیں تو جھٹکا سا لگتا ہے۔''

حالانکہ یہ صورت حال مساوی الوزن سہ مصرعی ماہیوں میں پیش آتی ہے۔

ضیاء شبنمی نے تادم تحریر کوئی ماہیا نہیں لکھا لیکن ماہیے کے بارے میں سب سے مزیدار بات انہوں نے لکھی۔ ان کے الفاظ میں ''یار لوگوں نے ماہیے کے بھی درمیانی مصرعے پر وار کیا ہوا

ہے۔میرے خیال میں پنجابی ماہیا اس قید سے آزاد ہے۔اگر آزاد نہیں ہے تو اردو ماہیے کو اس سے آزاد ہونا چاہئے۔

''خطوط کے صفحات پر دیگر ادیبوں میں عارف فرہاد، ہیرانند سوز، شاہد جمیل، نصیر احمد ناصر، ذکاء الدین شایاں، ناصر شہزاد اور صادق عدیل فرشتہ نے اپنے خطوط میں اختلافی رائے کا یا دوسرے موقف کی تائید کا انداز اختیار کیا لیکن اول الذکر تینوں اہم ادیب اب لوک لے کے مطابق عمدہ ماہیے کہہ رہے ہیں۔

ہمارے موقف کی حمایت میں کھل کر لکھنے والوں میں سعید شباب، نیاز احمد صوفی، ارشد خالد، راز سنتو کھ سری، ملاپ چند، عبدالقیوم، احمد حسین مجاہد، غلام شبیر رانا، طاہر مجید، اجمل پاشا اور ڈاکٹر عنوان چشتی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔بعض خطوط میں اگرچہ رواروی میں ماہیے کا ذکر کیا گیا لیکن ان سے بھی ماہیے کی طرف قارئین کی تھوڑی بہت توجہ مبذول ہوئی۔ ایسے مکتوب نگاروں میں رام لعل، جوگندر پال، افضل گورایہ، عابد انصاری، فیروز شاہ، سرمد جمالی، عباس رضوی، تنویر قاضی، فوزی خان، سحر سیال، مشتاق احمد، سجاد مرزا، ایم ڈی شاد، سرفراز تبسم، اکبر حمیدی وغیرہ شامل ہیں تاہم ماہیے کے فروغ میں نثار ترابی کے ایک طویل خط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔''اوراق'' کے شمارہ اگست، ستمبر 1995ء میں شائع ہونے والے نثار ترابی کے خط میں ان کا موقف کھل کر سامنے آیا تو شمارہ جنوری، فروری 1996ء میں میرا جوابی خط شائع ہوا۔ یہ دونوں خطوط ماہیے کی تفہیم میں خاصے مفید ثابت ہوئے۔

''اوراق'' کے شمارہ جنوری، فروری 1997ء میں ''ماہیا اور ماہیا نگاری'' کے زیر عنوان ایک الگ سیکشن بنایا گیا۔اس میں میرے مضمون ''ماہیے کا فروغ'' کے ساتھ چار درست وزن والے ماہیا نگاروں کو شامل کیا گیا۔ جولائی، اگست 1997ء کے شمارہ میں میرے ماہیوں کے مجموعہ ''محبت کے پھول'' پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے مرتب کردہ ماہیوں کے انتخاب ''رم جھم رم جھم'' پر اجمل پاشا کا تبصرہ شائع ہوا۔

1998ء میں ''اوراق'' کے دونوں شماروں میں گہما گہمی اور گرما گرمی رہی۔ ایک طرف

امین خیال کے ماہیوں کے مجموعہ ''یادوں کے سفینے'' پر ذوالفقار احسن کا تبصرہ اور نذیر فتح پوری کے ماہیوں کے مجموعہ ''ریگ رواں'' پر اسلم حنیف کا مضمون شائع ہوا تو دوسری طرف ظہیر غازی پوری نے ''اردو ماہیا فن، تکنیک اور موضوع'' کے زیرِ عنوان ایک مضمون ماہیے کی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ پیش کیا۔ اس مضمون کی بعض بنیادی اغلاط کی میں نے بھی اپنے تفصیلی خط میں نشاندہی کی لیکن ''جیسا مضمون ویسا جواب'' کے مصداق اس کا اصل جواب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے مضمون ''اردو ماہیا۔ بحث در بحث'' میں پیش کیا۔ بعد میں ظہیر غازی پوری نے بعض وضاحتیں کرنا چاہیں لیکن وہ عذر گناہ بدتر از گناہ ثابت ہوئیں۔

ماہیے کی خیر خواہی کے جذبے سے مضمون لکھنے والے ظہیر صاحب آخر میں اس بات پر خوش دکھائی دینے لگے کہ انہیں کسی دوست نے خط لکھ دیا ہے کہ ماہیے کا انجام بھی آزاد غزل جیسا ہوگا اس لئے اس بحث میں نہیں الجھیں۔

اسی برس میں میرا مضمون ''ماہیا کیوں؟'' ''اوراق'' کے جنوری کے شمارہ میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ماہیے کے تعلق سے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کے تین اہم سوالوں کے جواب پر مبنی تھا۔ اس مضمون کے نتیجہ میں مجھے ماہیے کے ادبی اور ثقافتی کردار پر غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔

بیسویں صدی کے آخری برس کے پہلے شمارہ میں میرا تحقیقی نوعیت کا مضمون ''اردو ماہیے کے بانی۔ ہمت رائے شرما'' ''اوراق'' نے شائع کیا لیکن اس شمارہ کا ہنگامہ خیز مضمون پرویز بزمی نے تحریر کیا تھا۔ ''پنجابی ماہیا کی ہیئت اور وزن'' کے زیرِ عنوان چھپنے والے مضمون میں پرویز بزمی نے دعویٰ کیا کہ ماہیا سہ مصرعی نہیں بلکہ ڈیڑھ مصرعی صنف ہے۔ اس مضمون کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے میں نے پرویز بزمی کے بنیادی اعتراض کا مدلل جواب دیا جو ''اوراق'' کے شمارہ جولائی، اگست 1999ء میں شائع ہوا۔

اسی شمارہ میں علی محمد فرشی کے ماہیا نما ثلاثی کے مجموعہ ''دکھ لال پرندہ ہے'' پر ستیہ پال آنند کا مضمون شائع ہوا۔ اردو ماہیے کی تحریک کے نتیجہ میں اب اگر مہاراشٹر، بہار یا راجستھان کے کسی ادیب سے بھی پوچھا جائے تو وہ پنجابی ماہیے کے بارے میں اتنی بات تو آسانی سے بتادے گا کہ

پنجابی ماہیے میں عمومی طور پر عورت کی آواز سنائی دیتی ہے۔

اسی بنیاد پر میں نے اپنی کتاب ''اردو میں ماہیا نگاری'' میں اس کے سرے ہندی گیت کی قدیم روایت سے بھی جوڑے تھے لیکن ستیہ پال آنند نے اپنے مضمون میں اسے ہندی گیت کی ''روایت کے برعکس'' لکھتے ہوئے ''مرد کی طرزِ سخن'' قرار دیا ہے جو علمی لحاظ سے حیران کن بات ہے۔ ستیہ پال آنند نے ''دکھ لال پرندہ ہے'' کے ایسے اوزان کے ماہیوں کی بابت بھی خاموشی اختیار کی ہے۔

تیری سیج گلابی
اپنے باغوں سے کچھ
سپنے بھیج گلابی

دور چمکتے تارے
کروٹ کروٹ روئیں
ہم خوابوں کے مارے

اک بے نام سا رشتہ
میں پاگل سودائی
وہ انجان فرشتہ

ماہیے کی ڈیڑھ مصرعی ہیئت کے حوالے سے مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر اور سیدہ حنا اپنے ہم وزن ''ماہیے'' سہ مصرعی فارم میں لکھ رہے تھے تب انجم نیازی نے کسی بحث کے بغیر ''اوراق'' میں اپنے ویسے ہی ''ماہیے'' ڈیڑھ مصرعی فارم میں شائع کرائے تھے لیکن تب بھی کسی نے اس فارم میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

ماہیے کے مزاج کے سلسلے میں بعض لوگوں نے اہم سوال اٹھائے ہیں اور خصوصاً غزل کے مضامین سے اسے بچانے کی تاکید کی ہے۔ پھر ماہیے کے معیار کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ''اوراق'' میں چھپنے والے ماہیوں کا ایک بڑا حصہ معیاری تخلیقات پر مشتمل ہے۔ جہاں تک غزل کے مضامین سے بچنے کی تاکید کا تعلق ہے، مشورہ اچھا بھی ہے اور ماہیے کے لئے مفید بھی ثابت ہوگا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اردو غزل اتنی طاقتور صنف ہے کہ آزاد نظم بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکی۔ ماہیا تو ویسے بھی بعض مضامین کے اظہار میں غزل سے خاصا قریب ہے اور تو اور جدید نظم کے شاعر نصیر احمد ناصر بھی جب اپنے انداز میں ''ماہیا'' کہتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔

دیوار نہ در ہوتا
ناصر کسی بستی میں
ایسا کوئی گھر ہوتا
(مطبوعہ ''اوراق'' اپریل۔مئی 1987ء)

تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ غالب کی ''بے در و دیوار کا گھر'' بنانے کی خواہش غیر ارادی طور پر ان کے ہاں آ گئی ہے۔

سو غزل کے مضامین سے بچنے اور ماہیے کے مزاج کو برقرار رکھنے کی تلقین جاری رہنی چاہئے تاہم غیر پنجابی علاقوں میں نئے تجربات کے باعث اگر کہیں اجنبیت کا ہلکا سا احساس ہوتا ہے تو اس سے بھی مانوسیت پیدا کرنی چاہئے کہ یہ مرحلہ ابھی ماہیے کا بالکل ابتدائی مرحلہ ہے۔ یہاں ''اوراق'' میں چھپنے والے آٹھ برسوں کے ماہیوں کا ایک انتخاب پیش کر رہا ہوں تا کہ ماہیے کے معیار کی بات کرتے وقت ایسے ماہیوں کو بھی مدنظر رکھا جا سکے۔

جب اونچی ہوں پروازیں
سنتے نہیں پنچھی
پھر پیڑوں کی آوازیں
(سعید شباب)

000

اے میرے سخی داتا
میں کب اجڑا تھا
کچھ یاد نہیں آتا
(احمد حسین مجاہد)

000

دکھ سکھ کا میل دکھا
ہنستے گاتے ہوئے
اس ہجر کو جھیل دکھا
(فرحت نواز)

000

تصویر نہیں بدلی
عمریں بیت گئیں
تقدیر نہیں بدلی
(اجمل پاشا)

000

وہ دور نہیں دیکھا
ہم نے بزرگوں کا
لاہور نہیں دیکھا
(پروین کمار اشک)

000

ماہی کبھی آ ملنے
پھول اناروں کے
شاخوں پہ لگے کھلنے
(ضمیر اظہر)

000

بے چین نہ ہو ماہیا
آج اکیلے ہیں
کل ہوں گے دو ماہیا
(قاضی اعجاز محور)

000

رنگین کہانی دو
اپنے لہو سے تم
گلشن کو جوانی دو
(مناظر عاشق ہرگانوی)

000

ہونٹوں پہ مچلتی ہے
پیاس ہے اندر کی
آنکھوں میں بھی پلتی ہے
(نذیر فتح پوری)

000

انگلی میں انگوٹھی ہے
سارے زمانے سے
پھر آج وہ روٹھی ہے
(ندیم شعیب)

000

بیٹھے ہوئے ناؤ میں
دونوں سلگتے ہیں
اس پریت الاؤ میں
(یوسف اختر)

000

صورت مرے بھائی کی
یاد دلاتی ہے
بابا کی جدائی کی
(غزالہ طلعت)

000

ساحل پر چھل آئی
کل تجھے آنا تھا
پر تیری نہ کل آئی
(ایم اے تنویر)

000

لذت ہی نرالی ہے
داور محشر سے
لو ہم نے لگا لی ہے
(رشید اعجاز)

000

بیری کی گھنی چھاؤں
درد کے ماروں سے
مسعود بھرے گاؤں
(مسعود ہاشمی)

000

تاریکیٔ زنداں ہوں
صبح بنارس تو
میں شام غریباں ہوں
(شجاعت علی راہی)

پانی میں اگے بوٹے
جاگ پڑی آنکھیں
پر خواب نہیں ٹوٹے
(نوید رضا)

سُونا ہے یہ گھر ماہیا
پل پل در کی طرف
اٹھتی ہے نظر ماہیا
(پرویز بزمی*۵)

کیوں شہر ہوا ویراں
تم ہی خبر لینا
داتا کے سجن میراں
(سلطانہ مہر)

000

موجوں کے کٹاؤ میں
عمر گذاری ہے
ہم نے ترے چاؤ میں
(عارف فرہاد)

000

اشکوں سے بوائی کی
قسمت میں لکھی
تھی فصل جدائی کی
(ثریا شہاب)

000

چڑیوں نے چنے تنکے
ترے دوارے ہم
مہمان تھے دو دن کے
(رستم نامی)

000

بازار میں سایا ہے
چھوڑ مرا بازو
شاید کوئی آیا ہے
(ذوالفقار احسن)

000

اک گندل سرسوں کی
پل میں ٹوٹ گئی
تھی یاری برسوں کی
(شرون کمار ورما)

000

مل مجھ سے اکیلی تو
نام سے ان کے اب
مت چھیڑ سہیلی تو
(انور مینائی)

000

اک پھول چنبیلی کا
ملنا لگا اچھا
بچپن کی سہیلی کا
(شاہدہ ناز)

000

کتنی بے حال ہوئی
کوئی سنبھالے مجھے
میں غم سے نڈھال ہوئی
(ترنم ریاض)

000

مہکار ہے کلیوں کی
جیسے دعا کوئی
دھرتی پہ ہوولیوں کی
(حیدر قریشی)

بن نیند کے ہی سو جا
خواب کہیں رکھ دے
اور میری طرح ہو جا
(شاہد جمیل)

اردو کے پیاروں کو
اللہ خوش رکھے
سب ماہیا نگاروں کو
(ہمت رائے شرما)

اردو ماہیے کی تحریک کا آغاز ''اوراق'' سے ہوا۔ بعض دیگر ادبی رسائل کے اہم اور تاریخی کردار کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سال بھر کے وقفہ کے بعد جب ''اوراق'' نے اردو ماہیے کے فروغ میں دلچسپی لی تو ایک بڑا ادبی فورم ہمیں مل گیا۔ چونکہ ہمیں اپنے موقف کی سچائی کا مکمل

یقین تھا اسی لئے ''اوراق'' میں چھپنے والے مخالفین کے موقف کا فائدہ بھی ہمیں پہنچا۔ ہمارے جوابی موقف سے نہ صرف ماہیے کے خدوخال مزید واضح ہوئے بلکہ اس تحریک کو بڑی ادبی سطح پر مقبولیت بھی نصیب ہوئی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے بعض خطوط نہ صرف میری حوصلہ افزائی کا موجب بنے بلکہ انہوں نے میری درست سمت میں رہنمائی بھی کی۔ آج میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے مضبوط موقف کے خلاف کئے گئے اہم اعتراضات میں سے ایک اعتراض بھی ایسا نہیں ہے جس کا مدلل جواب نہ دے دیا گیا ہو۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

حاشیہ

*۱: اس شمارہ میں ایم اے تنویر کے درست وزن کے دو عمدہ ماہیے بھی شامل ہیں۔

*۲: سجاد مرزا اب مسلسل درست وزن میں ماہیے کہہ رہے ہیں۔

*۳: ڈاکٹر مناظر عاشق نے ''اوراق'' کے اگلے شمارہ میں اپنے ''تجرباتی ماہیوں'' کے بارے میں خود وضاحت کر دی تھی۔

*۴: انور مینائی اس شمارہ کے بعض ماہیوں میں وزن کے لحاظ سے تھوڑا سا لڑکھڑائے ہیں۔

*۵: برادرم پرویز بزمی سے معذرت کے ساتھ ان کا ماہیا سہ مصرعی فارم میں دے رہا ہوں۔

(مطبوعہ ''اوراق'' لاہور خاص نمبر، جنوری۔فروری 2000ء)

جدید اردو ادب کے عظیم دانشور اور ادیب

ڈاکٹر وزیر آغا انتقال کر گئے

اناللہ و انا الیہ راجعون

اردو کے عظیم دانشور اور شاعر و ادیب ڈاکٹر وزیر آغا ۸/ستمبر ۲۰۱۰ء کو رات ایک بجے کے قریب اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ **اناللہ و انا الیہ راجعون**

وزیر آغا کی عمر ۸۸ برس تھی۔ ان کی وفات سے محض الفاظ کی رسمی حد تک نہیں بلکہ حقیقت میں اردو دنیا ایک بہت بڑے تخلیق کار اور ایک بہت بڑے دانشور سے محروم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا۔ ۱۹۶۰ء میں مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی جریدہ ''ادبی دنیا'' کے جائنٹ ایڈیٹر بنے اور مولانا کی وفات تک ادبی دنیا کے ساتھ منسلک رہے۔ ان کی وفات کے بعد ۱۹۶۵ء میں تاریخ ساز ادبی جریدہ اوراق کا اجرا کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کثیر الجہت شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ مفکر دانشور بھی تھے۔ اردو ادب میں میڈیا کر دانشوروں کی تو ہمیشہ بہتات رہی ہے لیکن علم و معرفت کے لحاظ سے ڈاکٹر وزیر آغا کے پائے کا مفکر دانشور اب دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ اردو انشائیہ کے بانی کی حیثیت سے انہوں نے ایک بڑا ادبی کام کیا۔ اردو انشائیہ کے خدوخال کو نمایاں کرنے میں بہت زیادہ محنت سے کام لیا اور اس نئی صنف کی شدید ترین بلکہ اخلاقی لحاظ سے بدترین مخالفت کے باوجود اسے اردو

میں رائج کر دکھایا۔ شاعری میں غزل اور نظم دونوں اصناف میں ان کا انتہائی گراں قدر حصہ ہے۔ جدید نظم کے سلسلہ میں تو ان کا کام اتنا اہم ہے کہ ان کے مقام کا تعین کرنے کے لیے جدید نظم کے پورے سلسلے کا از سرِ نو مطالعہ کرنا پڑے گا۔ ان کی دو طویل نظمیں ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' اردو کی شاہکار جدید نظمیں ہیں۔

وزیر آغا نے ''مسرت کی تلاش'' سے اپنا علمی و تنقیدی سفر شروع کیا۔ طنز و مزاح اور حقیقی مسرت کے فرق کی جستجو میں وہ تخلیقی اسرار اور خود کو جاننے کی لذت سے آشنا ہوئے۔ کائنات کے اسرار و رموز کی جستجو انہیں بیک وقت سائنس، فلسفہ اور الٰہیات کی دنیاؤں میں لیے لیے پھری۔ انہوں نے مغربی علوم کا بھرپور مطالعہ کیا لیکن مشرقی علوم کے روبرو لا کر پھر اس مطالعہ سے اپنے نتائج خود اخذ کیے۔ امتزاجی تنقید کے اصول کو علمی سطح پر بھی اور عملی سطح پر رائج کیا۔ مجموعی طور پر وزیر آغا نے ساٹھ سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں بعض ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان کی مرتب کردہ یا تالیف و تدوین کردہ کتب کی الگ سے فہرست ہے۔ ان کی تخلیقی کتابیں تو تمام کی تمام اپنی جگہ مطالعہ کا تقاضا کرتی ہیں جبکہ علمی و تنقیدی کتابوں میں سے ''اردو شاعری کا مزاج''، ''تخلیقی عمل''، ''دستک اس دروازے پر'' منفرد اور امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی بعض کتب اور تخلیقات کے انگریزی، ڈینش، یونانی، سویڈش، جرمن، ہسپانوی، مالٹیز، جاپانی، ہندی، بنگالی، مراٹھی، پنجابی، سرائیکی اور دوسری زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ وزیر آغا کے فن کی مختلف جہات پر تیرہ کے لگ بھگ رسائل کے مرتب کردہ خصوصی نمبرز یا کتابیں چھپ چکی ہیں۔ انڈو پاک کی یونیورسٹیوں میں ان پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے ۱۰ سے زائد مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ اردو کی علمی و ادبی دنیا کے وہ تمام لوگ جو میڈیائی شہرت کے پیچھے بھاگنے سے زیادہ ادب کو معرفتِ ذات و کائنات کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں، ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر سوگوار اور غم زدہ ہیں۔

کہنے کو چند گام تھا یہ عرصۂ حیات
لیکن تمام عمر ہی چلنا پڑا مجھے

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری

رات کا آخری تارا بھی ہے جانے والا **(وزیر آغا)**

(یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے ۸ ستمبر کو صبح پونے نو بجے ریلیز کی گئی)

حیدر قریشی (جرمنی سے)

بعد ازاں ان ویب سائٹس پر بھی یہ خبر شائع کی گئی۔

http://www.siasat.pk/forum/showthread.php?43296

(08-Sep-2010 07:53 AM)

http://sherosukhan.tripod.com/id990.html

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

08-Sep-2010 09:52 AM

http://www.siasat.pk/forum/showthread.php?43296-

آغا جی نے اپنے والد مرحوم کی وفات پر یہ نظم لکھی تھی۔آج ان کی وفات کے موقعہ پر ان کی یہ نظم جیسے خود کلامی کی صورت میں پھر سے لکھی گئی لگتی ہے۔ **نوٹ از حیدر قریشی**

سفر کا دوسرا مرحلہ: وزیر آغا

''چلی کب ہوا، کب مٹا نقشِ پا

کب گری ریت کی وہ ردا

جس میں چھپتے ہوئے تو نے مجھ سے کہا:

آگے بڑھ، آگے بڑھتا ہی جا

مڑ کے تکنے کا اب فائدہ؟

کوئی چہرہ، کوئی چاپ، ماضی کی کوئی صدا، کچھ نہیں اب

اے گلّے کے تنہا محافظ!

ترا اب محافظ خدا!''

~~~~~~~~~~~~~~~~